رجسٹرڈ نمبر آصفیہ (۱۲۰)

جلد (۴) عدد (۶)

رجسٹرڈ نمبر ایم (۲۹۵۰)

جمادی الاخری ۱۳۵۳ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (عہ) بیرون ہند کے لئے (مے) قیمت فی پرچہ (۸ر)

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے صرف ایک باب (باب پنجم) کی فہرست ملاحظہ ہو

طریق جنگ اور مقصد جنگ کا فرق۔

اسلام سے پہلے عرب کا طریق جنگ۔ لغت اور ادب کی شہادت۔ جنگ کے محرکات: غنیمت کا شوق، تفاخر، خون کا انتقام۔ جنگ کے وحشیانہ طریقے۔ مثلہ، غیر مقاتلین کا قتل، زندہ جلانا، اسیران جنگ سے بدسلوکی، عورتوں کی بے حرمتی، غفلت میں حملہ کرنا، دشمن کی کھوپری میں شراب پینا، دھوکہ سے قتل کرنا، غدر و بدعہدی۔ عرب کی وحشیانہ جنگ کے چند نمونے: حرب داحس، حرب بسوس، حرب فجار، اوس و خزرج کی لڑائیاں

اسلام سے پہلے روم و ایران کا طریق جنگ۔ مذہبی مظالم، سفراء پر تعدی، بدعہدی، جنگ میں وحشیانہ اعمال، اسیران جنگ کی حالت۔

اسلام کی اصلاحات۔ مقصد جنگ کی تطہیر۔ طریق جنگ کی تطہیر۔ وحشیانہ افعال کے خلاف عام ہدایات، غیر مقاتلین کے قتل کی ممانعت، مثلہ کی ممانعت، قتل جریح و اسیر کی ممانعت، بدنظمی و انتشار کی ممانعت، لوٹ مار کی ممانعت، غفلت میں حملہ کرنے کی ممانعت، آگ میں جلانے کی ممانعت، غارت گری و تباہ کاری کی ممانعت، قتل صبر کی ممانعت، قتل سفیر کی ممانعت، بدعہدی کی ممانعت، شور و ہنگامہ کی ممانعت، .... اسلامی طریق جنگ کا مکمل نمونہ: فتح مکہ

جنگ کے مہذب قوانین۔ اطاعت امام، وفائے عہد، عہد شکنی کے مقابلہ میں مسلمانوں کا طرز عمل، صلح و امان، اسیران جنگ، غنیمت۔ مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ، معاہدین کے حقوق، غیر معاہدین کے حقوق، ذمیوں کے عام حقوق، ذمیوں کے لباس کا مسئلہ۔

چند مستثنیٰ واقعات۔ بنو نضیر کا اخراج، بنو قریظہ کا معاملہ، کعب بن اشرف کا قتل، یہود خیبر کا اخراج، اہل نجران کا اخراج۔

آخری تبصرہ، قوانین شریعت کے اصول استنباط۔ جدید قانون جنگ کی تدوین۔

کل کتاب کی ضخامت ۵۰۰ صفحہ۔ قیمت بلا جلد للعہ انگریزی۔ ۴؍ سکہ عثمانیہ مجلد صہ انگریزی۔ ۵؍ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

حکومت اور فرمانروائی اور غلبہ و استیلاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ۔ دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ اسی کے تخیلات، اسی کے معتقدات، اسی کے نظریات دماغوں پر چھا جائیں۔ ذہنیتیں اسی کے سانچے میں ڈھلیں۔ تہذیب اسی کی تہذیب ہو، علم اسی کا علم ہو۔ اسی کی تحقیق تحقیق سمجھی جائے اور ہر وہ چیز باطل ٹھیرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھیرائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی بازو ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلہ میں اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں، اور کلی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائل ثروت پر قابض اور ان کے نظم مملکت پر حاوی ہو جائے۔

اس کے مقابلہ میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت، دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجئے جو اوپر غلبہ کی دونوں قسموں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

یہ دونوں قسمیں ایک اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو۔ اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں ذہنی غلبہ بھی ہو۔ لیکن فطری

قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی، اور تحقیق و اکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے، اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے اور جو قوم تفکر و تدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادی تنزل میں بھی مبتلا ہوجاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا، اور مغلوبیت نتیجہ ہے کمزوری کا، اس لئے ذہنی و مادی حیثیت سے درماندہ اورضعیف قومیں اپنی درماندگی وضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں، اُسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لئے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں، اور طاقتور ——— ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے طاقتور——— قومیں ان کے دماغ اور ان کے جسم دونوں پر حکمران ہوجاتی ہیں۔

مسلمان آج کل اسی دوہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسموں کی غلامیاں پوری طرح مسلط ہیں۔ اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری نصیب بھی ہے، وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، ان کے دفتر، ان کے بازار، ان کی سوسائیٹی، ان کے گھر، حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبان حال سے شہادت دیرہے ہیں۔ کہ ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمران ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو، بہرصورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے، اور وہ باطل ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی، ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی، اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے اُسے

درست سمجھتے ہیں مطمئن ہوتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اتر آئی اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی علانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے۔ کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔

جب ہماری آزاد قوموں کا یہ حال ہے، تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں ان کی ذہنی غلامی کا کیا پوچھنا۔

اس غلامی کا سبب کیا ہے؟ اس کی تشریح کے لئے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے مگر مختصراً اس کو چند لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ذہنی غلبہ و استیلاء کی بناء دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہنما بن جاتی ہے، اور اسی کے افکار دنیا پر چھا جاتے ہیں۔ اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے اس کے افکار و معتقدات میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دماغوں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں، بلکہ کسی دوسری مجتہد و محقق قوم کے طاقتور افکار و معتقدات کا سیلاب ان کو خود اپنی جگہ پر بھی نہیں ٹھیرنے دیتا۔ مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے، تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں۔ اسلامی فکر ساری نوع انسانی کے افکار پر غالب رہی۔ حسن اور قبح، نیکی اور بدی، غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار پایا، اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افکار و اعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی۔ مگر جب مسلمانوں میں ارباب فکر اور اصحاب تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے، جب انہوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا، جب وہ اکتساب علم کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انہوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفا دیدیا۔

دوسری طرف مغربی قومیں اس راہ میں آگے بڑھیں۔ انہوں نے غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا

انہوں نے کائنات کے راز ٹٹولے، اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے۔ اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ مغربی قومیں دنیا کی رہنما بن گئیں، اور مسلمانوں کو اسی طرح ان کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا، جس طرح کبھی دنیا نے خود مسلمانوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

چار پانچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے، اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً مغربی اقتدار کا سیلاب اٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ نیند کے ماتے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے تو دیکھا کہ یورپ قلم اور تلوار دونوں سے مسلح ہے، اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت نے مدافعت کی کوشش کی مگر نہ قلم کا زور تھا نہ تلوار کا، شکست پر شکست کھاتی چلی گئی۔ رہا قوم کا سواد اعظم تو اس نے اسی سنت پر عمل کیا جو ہمیشہ سے کمزوروں کی سنت رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، علمی شواہد کی تائید اور نظر فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب سے آئے، آرام طلب دماغوں اور مرعوب ذہنیتوں نے ان کو ایمان کا درجہ دے دیا۔ پرانے مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، اور تمدنی آئین جو محض روایتی بنیادوں پر قائم رہ گئے تھے، اس نئے اور طاقتور سیلاب کی رو میں بہتے چلے گئے۔ اور ایک غیر محسوس طریقے سے دلوں میں یہ مفروضہ جاگزیں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب سے آتا ہے وہی حق ہے، اور وہی صحت و درستی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی۔ بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلہ میں اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی۔ بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس

آنے والی تہذیب سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئیں، اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آنے پائی لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے یہ ایک مستقل اور مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتی ہے جو فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اور بدقسمتی سے مغربی تہذیب کے اساسی اصول کلیتہً اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ وہ پانچ چھ سو سال سے دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ جس تاریخ پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہوگئی، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کائنات کے آثار کا مشاہدہ، ان کے اسرار کی تحقیق، ان کے کلی قوانین کی دریافت ان کے مظاہر پر غور و فکر، اور ان کو ترتیب دیکر قیاس و برہان کے ذریعہ سے نتائج کا استنباط، کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے، مگر سوء اتفاق سے نشاۃ جدیدہ (Renaissance) کے عہد میں جب یورپ کی نئی تحریک رونما ہوئی تو اس تحریک کا مقابلہ ان عیسائی پادریوں سے ہوا جنہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ اگر جدید علمی تحقیقات اور فکری اجتہاد سے، ان بنیادوں میں ذرا سا بھی تزلزل واقع ہوا تو اصل مذہب کی عمارت پیوند خاک ہو جائیگی۔ اس غلط تخیل کے زیر اثر انہوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اس کے روکنے کے لئے قوت سے کام لیا، مذہبی عدالتیں (Inquisitions) قائم کی گئیں۔

جن میں اس تحریک کے علمبرداروں کو سخت وحشیانہ اور ہولناک سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی، اس لئے تشدد دے دینے کے بجائے اور بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ حریت فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کردیا۔

ابتدا میں لڑائی حریت فکر کے علمبرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان تھی۔ مگر چونکہ مذہبی پیشوا، مذہب کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہے تھے، اس لئے بہت جلدی اس لڑائی نے مسیحیت اور آزادیِ خیال کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کرلی۔ اس کے بعد نفس مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) اس تحریک کا مدمقابل بن گیا۔ سائنٹفک طریقہ پر سوچنے کے معنی یہ قرار پائے کہ یہ طریق فکر، مذہبی طریق فکر کی عین ضد ہے۔ جو شخص اس طریق سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہوگیا کہ مذہبی نظریہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریہ کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالم طبیعت کے تمام آثار اور جملہ مظاہر کی علت، کسی ایسی طاقت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چونکہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا، اس لئے جدید تحریک کے علمبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا، یا کسی فوق الطبیعت (Supernatural) ہستی کو فرض کئے بغیر کائنات کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اور ہر اس طریقہ کو خلاف حکمت (Unscientific) قرار دیں جس میں خدا کا وجود فرض کرکے مسائل کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دور کے اہل حکمت و فلسفہ میں خدا، اور روح یا روحانیت، اور فوق الطبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہوگیا، جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ سراسر جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لئے تبرّی نہ کرتے تھے کہ دلائل و براہین سے اس کا عدم وجود اور عدم وجوب ثابت ہوگیا تھا، بلکہ وہ اس سے اس لئے بیزار تھے کہ وہ ان کے اور ان کی آزادیِ خیال کے دشمنوں کا معبود تھا۔ بعد کی پانچ صدیوں میں

ان کی عقل و فکر اور ان کی علمی جد و جہد نے جتنا کام کیا اس کی بنیاد میں یہی غیر عقلی جذبہ تھا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو ان کا رخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا۔ اگرچہ ابتدا میں وہ خدا پرستی سے قریب تھے اور نیچریت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباہنا چاہتے تھے، مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھتے گئے، نیچریت خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی حتیٰ کہ خدا کا تخیل، اور خدا کے ساتھ ہر اس چیز کا تخیل جو عالم طبیعت سے بالاتر ہو ان سے بالکل غائب ہو گیا، اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادہ و حرکت کے سوا کوئی شئے ان کے نزدیک حقیقی نہ رہی۔ سائنس، نیچریت کا ہم معنی قرار پایا، اور اہل حکمت و فلسفہ کا ایمان اس نظریہ پر قائم ہو گیا کہ ہر چیز جو قابل حساب و پیمائش نہیں ہے، اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

مغربی فلسفہ و سائنس کی تاریخ اس بیان کی شاہد ہے۔ ڈیکارٹ Descartes (متوفی ۱۶۵۰ء) جو مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل ہے، اور مادہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے، مگر دوسری طرف وہی فلسفی ہے جس نے عالم طبیعت کے آثار کی توجیہ میکانکی (Mechanical) طریق پر کرنے کی ابتدا کی اور اس طریق فکر کی بنا رکھی جو بعد میں سراسر مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابس (Hobbes) (م ۱۶۷۹ء) اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ وہ فوق الطبیعت (Supernatural) کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے، نظام عالم اور اس کی ہر شے کو میکانکی توجیہ کے قابل قرار دیتا ہے، اور کسی ایسی نفسی یا روحی یا عقلی قوت کا قائل نہیں ہے جو اس مادی دنیا میں تصرف کرنے والی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ خدا کو بھی مانتا ہے اس حیثیت سے کہ ایسی ایک علت العلل کا ماننا ایک عقلی ضرورت ہے۔ اسی زمانہ میں اسپائنوزا Spinoza

م ۱۶۷۷ء اٹھا جو سترہویں صدی میں عقلیت Rationalism کا سب سے بڑا علمبردار تھا
مگر اس نے مادہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا، خدا اور کائنات کو ملا کر ایک کل بنا دیا،
اور اس کل میں خدا کے اختیار مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لائبنز (Leibniz م ۱۷۱۶ء) اور لاک
(Locke م ۱۷۰۴ء) بھی خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔

یہ سترہویں صدی کا فلسفہ تھا جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

اسی طرح سائنس نے بھی سترہویں صدی تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ کوپرنکس (Copernicus) کیپلر (Kepler) گیلیلیو (Galileo) نیوٹن (Newton) اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الٰہی نظریہ سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے، جو اس نظام کو چلا رہی ہیں، اور ان قوانین کو معلوم کرنے کے خواہشمند تھے جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے۔ یہ الٰہی نظریہ سے قطع نظر کرنا ہی دراصل اس دہریت اور نیچریت کا تخم تھا جو بعد میں حریت فکر کے درخت سے پیدا ہوئی، لیکن سترہویں صدی کے حکماء کو اس کا شعور نہ تھا۔ وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خط امتیاز نہ کھینچ سکے، اور یہی سمجھتے رہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں۔

اٹھارویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ جو طریق فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظام کائنات کی جستجو کرے گا۔ وہ مادیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ (John Toland) ڈیوڈ ہارٹلے (David Hartley) جوزف پرسٹلے (Joseph Priestley) والٹیر (Voltaire) لامیٹری (La Mettrie) ہولباخ Holbach کیبانیس (Cabanis) ڈینس ڈائڈرو (Denis Diderot) مانٹسکیو Montesquieu

روسو (Rousseau) اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفہ وحکماء پیدا ہوئے جنہوں نے یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کیا، یا اگر بعض نے اسے تسلیم کیا بھی تو اس کی حیثیت ایک دستوری فرمانروا (Constitutional Monarch) سے زیادہ نہ سمجھی جو نظام کائنات کو ایک مرتبہ حرکت میں لے آنے کے بعد گوشہ نشین ہو گیا ہے اور اب اس نظام کے چلانے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ لوگ عالم طبیعت، اور دنیائے مادہ و حرکت کے باہر کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے، اور ان کے نزدیک حقیقت صرف انہی چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتی ہیں۔ ہیوم (Hume) نے اپنی تجربیت (Empiricism) اور فلسفہ تشکیک (Scepticizm) سے اس طریق فکر کی زبردست تائید کی، اور معقولات کی صحت کے لئے بھی تجربہ ہی کو معیار قرار دینے پر زور دیا۔ برکلے (Berkeley) نے مادیت کی اس بڑھتی ہوئی رو کا جاتوڑ مقابلہ کیا مگر وہ اس کو نہ روک سکا۔ ہیگل (Hegel) نے مادیت کے مقابلہ میں تصوریت (Idealism) کو فروغ دینا چاہا مگر ٹھوس مادے کے مقابلہ میں لطیف تصور کی پرستش نہ ہوئی۔ کانٹ (Kant) نے بیچ کی راہ نکالی۔ خدا کی ہستی، روح کا بقا، اور ارادہ کی آزادی ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو ہمارے علم میں آسکیں۔ یہ چیزیں جانی نہیں جا سکتیں۔ تاہم ان پر ایمان لایا جا سکتا ہے، اور حکمت عملی (Practicalreason) اس کی مقتضی ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے۔ یہ خدا پرستی اور نیچریت کے درمیان مصالحت کی آخری کوشش تھی لیکن ناکام ہوئی۔ کیونکہ جب عقل و فکر کی گمراہی نے خدا کو محض وہم کی پیداوار یا حد سے حد ایک معطل اور بے اختیار ہستی قرار دے لیا تو محض اخلاق کی حفاظت کے لئے اس کو ماننا، اس سے ڈرنا، اور اس کی خوشنودی چاہنا، سراسر ایک غیر عاقلانہ فعل تھا۔

انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوگت (Vogt) بوخنر (Buchner)

تسو بیے Czolbe کومت (Comte) موشات (Moleschott) اور دوسرے حکماء و فلاسفہ نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شئے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مل (Mill) نے فلسفہ میں تجربیت، اور اخلاق میں افادیت (Utilitarianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقائیت اور نظام کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہوجانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology) عضویات (Phyciology) ارضیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology) کے انکشافات، عملی سائنس کی ترقی اور مادی وسائل کی کثرت۔ نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں راسخ کردیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپ سے آپ لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ کوئی اس کو چلانے والا اور ان قوانین کو نافذ کرنے والا نہیں ہے۔ آپ سے آپ ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے۔ کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بخود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادے میں جان کہیں باہر سے نہیں ڈالی جاتی بلکہ خود مادہ جب بہ نظم میں ترقی کرتا ہے، تو اس میں جان پڑجاتی ہے، نمو حرکت ارادی، احساس، شعور، فکر، سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبیعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں اسی طور کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی آزاد ارادہ نہیں ہے۔ ان کے نظام کا درہم برہم ہوجانا، ان کی انرجی کا خرچ ہوجانا ہی ان کی موت ہے، جو فنائے محض کی ہم معنی ہے۔ جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہوگئے۔ اب ان کے لئے حشر اور بار دیگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اس دہریت اور مادیت کو استحکام بخشنے، اور ایک مدلل اور منظم

علمی نظریہ کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی کتاب اصل الانواع Origin of species جو ۱۸۵۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے ایک ایسے طریق استدلال سے جو انیسویں صدی کے سائنٹیفک دماغوں کے نزدیک استدلال کا محکم ترین طریقہ تھا، اس نظریہ پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ کائنات کا کاروبار خدا کے بغیر چل سکتا ہے، آثار و مظاہر فطرت کے لئے خود فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علت کی حاجت نہیں۔ زندگی کے ادنیٰ مراتب سے لیکر اعلیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقاء ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل و حکمت کے جوہر سے عاری ہے۔ انسان اور دوسری انواع حیوانی کو پیدا کرنے والا کوئی صانع حکیم نہیں ہے، بلکہ وہی ایک جاندار شَے جو کبھی کیڑے کی شکل میں رینگا کرتی تھی، تنازع للبقاء، اور انتخاب طبیعی کے نتیجہ کے طور پر ذی شعور اور ناطق انسان کی شکل میں نمودار ہو گئی۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اس میں نہ کسی علیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے، نہ نبوت اور وحی و الہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور، نہ حیات دنیا کے حساب کتاب کا کوئی کھٹکا، نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال۔ نہ زندگی کے حیوانی مقاصد سے بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خدا ترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق جوئی، حسن اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، حیا، پرہیزگاری، اور پاکیزگی کے ان تصورات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا راستہ اس راستہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے، ان کو یہ تہذیب بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتی ہے، اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی

عمارت قائم کرتی ہے، ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھیر سکتی۔ گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہوگا اسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ تہذیب اپنی مادہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرق اقصیٰ تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار، اور حاکمانہ استیلاء سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے، ان کے لئے مشکل ہوگیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور ان کی پروردہ تہذیب کے رعب و داب سے محفوظ رہتے خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہ راست کسی مغربی سلطنت کے زیر حکم آگئے تھے۔ ان کو اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کے لئے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے۔ اور چونکہ یہ تحصیل علم، خالص تحصیل علم کی خاطر نہ تھی، اور مزید برآں ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب، تہ کیا گیا تھا، اس لئے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹیفک نظریات کا اثر قبول کرلیا، ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں، ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ پیدا ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ خود غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہوگئی ہیں، ذہنیتوں کا وہ سانچہ ہی بگڑ گیا ہے جس سے

اسلامی طریق پر سوچنا اور سمجھا جا سکتا تھا مغربی طریق پر سوچنے، اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے تو فروع میں طرح طرح کے شبہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابل تعجب نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سواد اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلاء سے قطع نظر، مغرب کا علمی اور فکری داب و تسلط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح بدل دیے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لئے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لئے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اشکال اس وقت تک دور نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں آزاد اہل فکر پیدا نہ ہونگے۔ اسلام میں ایک نشأۃ جدیدہ (Renaissance) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے اس کو اب الٹے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لیجانا ممکن نہیں ہے جن سے وہ چھ سو برس پہلے گذر چکی ہے علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظام فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو، ایک نئی حکمت طبیعی (Natural Science) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اٹھے، الحدانہ نظریہ کو توڑ کر الٰہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس

قائم کریں اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور اس میں مغرب کی مادی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مقصود و مدعا کو تمثیل کے پیرایہ میں یوں سمجھیے کہ دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رخ پر سفر کرتی ہے جس رخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں جو لوگ اس میں بیٹھے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گاڑی جا رہی ہے خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اگر کوئی مسافر اس راہ پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رخ آگے کے بجائے پیچھے یا دائیں بائیں پھیر دے۔ مگر نشست کا رخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رخ بدلنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے۔ اور اس کی رفتار کو اُس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں، اور فکر اسلامی سے بے بہرہ ہیں۔ اس لئے گاڑی اپنے مسافروں کو لئے ہوئے الحاد اور مادہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے، اور سب مسافر طوعاً و کرہاً اسلام کی منزل مقصود سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اب اس رفتار کو بدلنے کے لئے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مرد اٹھیں اور جد و جہد کر کے انجن کو ان ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا گاڑی کا رخ نہ بدلے گا، اور ہمارے جھنجھلانے بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود وہ اسی راہ پر سفر کرتی رہیگی جس پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔

مقالات

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

۱۶

ایمان

۵ - ایمان بالیوم الآخر

نظام عالم ایک حکیمانہ نظام ہے | حیات اخروی کی ضرورت کا اثبات دراصل اس سوال کے تصفیہ پر موقوف ہے کہ آیا یہ کائنات کسی حکیم کا فعل ہے، یا بلا کسی حکمت کے آپ سے آپ بن گئی ہے؟

زمانۂ حال کا سائنس اور سائنٹیفک فلسفہ کہتا ہے کہ اس نظام کو کسی صانع حکیم نے نہیں بنایا۔ یہ آپ سے آپ بن گیا ہے، اور ایک خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی طرح اپنے تمام اجزاء سمیت (جن میں انسان بھی شامل ہے) چل رہا ہے۔ مادہ اور توانائی (Energy) کا باہمی تعامل جب روز ختم ہو جائیگا، اسی روز یہ نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس کا درہم برہم ہونا فنائے مطلق کا ہم معنی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا ایک نظام، جس کو ایک اندھی طبیعت (Nature) بلا کسی علم، عقل شعور، ارادہ اور حکمت کے چلا رہی ہے، اس میں کسی مقصدیت اور حکمت کی تلاش بالکل لاحاصل ہے۔ اسی وجہ سے سائنس نے آثار کائنات کی مقصدی تعلیل (Teleological Causation) کو اپنے حدود سے نہ صرف خارج کر دیا ہے، بلکہ اس طریق فکر کو سرے سے لغو و بے معنی قرار دیا ہے، اور قطعیت کے ساتھ دعوی کیا ہے کہ اس کائنات اور اس کی کسی شے اور کسی فعل میں کوئی مقصد نہیں پایا جاتا۔ آنکھیں دیکھنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ دیکھنا نتیجہ ہے مادہ کی اس خاص تنظیم کا جو آنکھوں میں پائی جاتی ہے۔ دماغ اس لئے نہیں ہے کہ سوچے اور شعور

و فکر کا محل بنے، بلکہ خیالات دماغ کے مادے سے اسی طرح نکلتے ہیں جس طرح جگر سے صفرا نکلتا ہے۔ یہ محض غلط فہمی ہے کہ اشیاء کے طبیعی افعال کو ان کا مقصد قرار دیا جاتا ہے، اور ان کے وجود میں کسی حکمت اور کسی عقل کی جستجو کی جاتی ہے۔

اس نظریہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو حیات دنیوی کے بعد کسی حیات اخروی کی ضرورت تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رہتی۔ کیونکہ جس کائنات کا نظام ایک اندھی بے عقل و شعور طبیعت کے ہاتھوں کسی مقصد و غایت کے بغیر چل رہا ہے، اس کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اور اس کی ہر شے عبث ہے۔ عبث بنی ہے اور عبث ہی تمام ہو کر فنا ہو جائیگی۔ مستبعد ہے کہ ایسی اندھی طبیعت عدل کی صفت سے متصف ہو، اور اس سے کسی حساب کتاب، اور انصاف کی امید کی جائے۔ تاہم اگر بالفرض وہ عدل سے متصف ہو بھی، تو جبکہ انسان اس کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونے کی طرح کھیل رہا ہے اور اپنے اختیار سے کچھ کرنا تو در کنار، سرے سے کوئی اختیار اور کوئی ارادہ رکھتا ہی نہیں، تو اس پر اپنے کسی اچھے یا برے فعل کی اسی طرح کوئی ذمہ داری نہیں ہے جس طرح ایک موٹر پر اپنی راست روی یا کج روی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور ذمہ داری کا سوال اٹھ جانے کے بعد دنیا ہی میں عدل و انصاف اور جزا و سزا کا سوال منقطع ہو جاتا ہے، کجا کہ اس کی خاطر ایک دوسری زندگی کی ضرورت تسلیم کی جائے۔

لیکن یہ نظریہ سراسر خلاف عقل ہے، اور کوئی عقلی دلیل یا علمی شہادت ایسی نہیں پیش کی گئی جس سے اس کی صداقت ثابت اور مبرہن ہو جائے۔ اس کی تائید میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا لب لباب بس اتنا ہے کہ ہم کو کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا اور کوئی چلانے والا نظر نہیں آتا۔ نہ اس کی پیدائش کا کوئی مقصد ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ ہم اس کو کسی بنانے والے کے بغیر چلتا ہوا دیکھتے ہیں اور اس کے چلنے کا مقصد معلوم کرنا نہ ہمارے لئے ممکن ہے، نہ ہم کو اس کے معلوم کرنے کی ضرورت۔ لیکن کسی شئے کی علت فاعلی اور علت غائی نہ معلوم ہونا اس کی دلیل نہیں ہو کہ اس کی کوئی علت غائی اور علت فاعلی ہے ہی نہیں۔ فرض کرو کہ ایک بچہ کسی مطبع کی مشین کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مشین کس غرض سے چلائی گئی ہے اس بنا پر وہ خیال کرتا ہے کہ یہ محض ایک کھلونا ہے جو بلا کسی مقصد و غایت کے چل رہا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ جس طرح اس مشین سے آواز پیدا ہوتی ہے، پرزے حرکت کرتے ہیں، زمین لرزتی ہے، اسی طرح کاغذ بھی چھپ چھپ کر نکلتے ہیں۔ اس بنا پر وہ حکم لگاتا ہے کہ جس طرح وہ افعال اس مشین کے چلنے کے نتائج ہیں اسی طرح کاغذوں کا چھپ چھپ کر نکلنا بھی اس کی حرکت کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ تمام افعال جو اس سے صادر ہو رہے ہیں ان میں سے صرف ایک فعل، یعنی کاغذوں کا چھپ کر نکلنا، اس پوری مشین کے بنائے جانے کا مقصد ہے، اور باقی تمام افعال مشین کی حرکت کے طبعی نتائج ہیں۔ اس کی طفلانہ نظر مشاہدہ کی اتنی قوت نہیں رکھتی کہ اس مشین کے پرزوں میں ترتیب، تناسب اور نظم کو محسوس کر سکے، اور یہ دیکھ سکے کہ اس کا ہر پرزہ جس صورت پر بنایا گیا ہے، اور جس مقام پر لگایا گیا ہے وہی صورت اور وہی مقام اس کے لئے موزوں ہے، اور مشین میں اپنے حصہ کا کام انجام دینے کے لئے وہ پرزہ اسی صورت کا اور اسی مقام پر ہونا چاہئے۔ اسی بنا پر وہ کند ذہن بچہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مشین یوں ہی لوہے کے ٹکڑوں کے باہم مل جانے سے آپ ہی آپ بن گئی ہے۔ اس کی عقلی قوتیں اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ وہ مشین کے افعال اور اس کی ترتیب کو دیکھ کر یہ قیاس کر سکے کہ اس کا بنانے والا ضرور کوئی حکیم شخص ہونا چاہئے جس نے ایسے اچھے اندازے، اور ایسے عمدہ نقشے پر ایسی مشین بنائی ہے جس کا کوئی پرزہ بیکار، غیر موزوں، غیر منضبط اور بے ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ ایسی حکمت و دانائی کے ساتھ جو چیز بنائی گئی ہے وہ ہرگز بے مقصد، بے مصلحت، اور عبث نہیں ہو سکتی۔

اب اگر پریس مشین کے اس ناقص مشاہدے اور اس پر اپنے ناقص غور و فکر سے وہ نادان بچہ یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ مشین کی کوئی علت فاعلی اور علت غائی نہیں ہے، نہ کوئی حکمت اس کے بنانے میں صرف ہوئی ہے، اور نہ کوئی حکیمانہ مقصد اس کی صنعت میں پیش نظر ہے، تو کیا کوئی عاقل و بالغ آدمی یہ تسلیم کرے گا کہ بچے نے اس مشین کی حقیقت کے متعلق ایک صحیح نظریہ قائم کیا ہے؟

اگر یہ بات ایک پریس مشین کے معاملے میں درست نہیں ہے تو اس نظام کائنات کے معاملہ میں کیوں کر درست ہوسکتی ہے جس کا ایک ایک ذرہ اپنے صانع کے علم، ارادے، حکمت، اور بصیرت پر شہادت دے رہا ہے۔ ناقص العقل اور کوتاہ بیں بچہ جو چاہے کہے۔ مگر کوئی صاحب عقل آدمی تو جس نے آنکھیں کھول کر اس کائنات کے آثار کا مشاہدہ کیا ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شک نہیں کرسکتا کہ ایسا محکم، استوار، مرتب اور متناسب نظام، جس میں کوئی شے بے کار اور عبث نہیں ہے، جس میں کوئی شے ضرورت سے کم یا زیادہ نہیں ہے، جس کا ہر جز اپنے مقام اور اپنی ضرورت کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک موزوں ہے، اور جس کے ضابطہ میں کہیں کوئی فتور نظر نہیں آتا، کسی حکمت، کسی علم، کسی ارادہ کے بغیر بن اور چل سکتا ہے۔

حکیمانہ نظام بے مقصد اور مہمل نہیں ہوسکتا قرآن مجید نے حیات اخروی کی ضرورت پر جو دلائل قائم کئے ہیں۔ وہ سب اسی بنیادی نظریہ پر مبنی ہیں کہ اس کائنات کا بنانے والا ایک حکیم ہے جس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے، اور جس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی جاسکتی جو خلاف حکمت ہو۔ اس بنیاد کو استوار کرنے کے بعد قرآن مجید کہتا ہے کہ۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۔ (۶:۲۳)	کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے، اور یہ کہ تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟ پادشاہ برحق، خدا اس سے بالاتر ہے (کہ اس سے کوئی فعل عبث صادر ہو)
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (۲:۷۵)	کیا انسان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائیگا۔
وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۔ وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ (۲:۴۴)	ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے تو ان کو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے یقیناً ان سب کے لئے فیصلہ کے دن تک کا وقت مقرر ہے۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآیِٔ رَبِّھِمْ لَکٰفِرُوْنَ۔ (۳۰:۱)	کیا انہوں نے خود اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو جو پیدا کیا ہے تو حکمت کے مطابق کیا ہے اور ان کے لئے ایک وقت مقرر ہے مگر بہت سے آدمی ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

ان آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ صرف اس لیے ہے کہ ایک مدت تک چلتا رہے، پھر کسی حاصل اور نتیجہ کے بغیر معدوم ہو جائے، تو یہ ایک لغو، اور عبث فعل ہوگا، ایک کھیل ہوگا۔ ایسا فعل ہرگز کسی حکیم کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اگر تم مانتے ہو کہ یہ کارخانہ خدا نے بنایا ہے۔ اور خدا تمہارے نزدیک حکیم ہے، تو تم کو عقل سے کام لے کر یہ سمجھنا چاہئے کہ موجودات میں سے کوئی شے بے مقصد وجود میں آنے والی اور بے حاصل و بے نتیجہ معدوم ہو جانے والی نہیں ہے۔ خصوصاً انسان جو کائنات ارضی کا گل سرسبد ہے، جس کی ذی شعور ہستی، اس کائنات ارضی کے تدریجی ارتقاء اور اس کی تمام حرکات و تحولات کا ماحصل ہے، اور جس کو اتنی حکمت کے ساتھ عقل و فکر، بینش و دانش اور اختیار و ارادہ سے آراستہ کیا گیا ہے، اس کی تخلیق کا مقصد اتنا مہمل نہیں ہو سکتا کہ وہ چند برس اس دنیا میں ایک مشین کی طرح بسر کرے، پھر مر کر معدوم ہو جائے۔

اقتضائے حکمت کے مطابق نظام عالم کا کیا انجام ہونا چاہئے

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ کائنات عبث اور کھیل نہیں ہے، اور نہ اس کی کوئی شے بے نتیجہ و بے حاصل ہے، تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ عدم مطلق کے سوا اس کارخانے کا اور کون انجام ایسا ہے جو اقتضائے حکمت کے عین مطابق ہو؟ اس سوال کا تفصیلی جواب قرآن حکیم کی آیات میں موجود ہے، اور وہ ایسا جواب ہے جس کو سننے کے بعد عقل سلیم بالکل مطمئن ہو جاتی ہے۔ مگر اس

جواب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چند امور ذہن نشین کر دئے جائیں:۔

۱۔ عالم وجود کے تمام آثار اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس نظام کے جتنے تغیرات و تحولات ہیں۔ ان سب کا رخ ارتقار کی جانب ہے۔ اس کی ساری گردشوں کا مقصود یہ ہے کہ نقص کو کمال کی طرف لے جائیں، اور اشیار کی ناقص صورتوں کو مٹا کر، انہیں کامل اور کامل سے کامل تر صورتیں بخشیں۔

۲۔ اس قانون ارتقار کا عمل چونکہ تغیر کی روش پر ہوتا ہے اس لئے ہر کون کے لئے ایک فساد ضروری ہے۔ ایک صورت کا وجود میں آنا اس کا مقتضی ہے کہ پہلی صورت فاسد ہو جائے اور ناقص صورت کا زائل ہونا کامل تر صورت کے وجود میں آنے کا دیباچہ ہوا کرتا ہے۔ یہ تغیرات و استحالات اگرچہ ہر آن ہوتے رہتے ہیں لیکن بہت سے خفی تغیرات کے بعد ایک جلی اور نمایاں تغیر واقع ہوا کرتا ہے جس میں ایک جلی اور نمایاں فساد پیش آتا ہے۔ یہی دوسری قسم کا فساد ہے جس کو ہم عرف عام میں موت یا زوال و فنا سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک صورت کے وجود میں آنے سے لیکر اس کی موت یا اس کے قطعی فساد تک ایک وقفہ ہوتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں عمر کہتے ہیں۔

۳۔ ہر صورت اپنے لئے ایک خاص محل چاہتی ہے جو اس کے مناسب حال ہوا کرتا ہے کوئی صورت کسی ایسے محل میں نہیں رہ سکتی جو اس کے لئے مناسب حال نہ ہو۔ مثلاً صورت نباتی کے لئے حیوانی جسم غیر مناسب ہے، اور صورت انسانی اسی جسم اور اسی مخصوص طور کے نظام جسمانی کی طالب ہے، جو انسان کے لئے بنایا گیا ہے پس اگر کسی شئے کو ایک ترقی یافتہ صورت دینی ہو تو لازم ہے کہ فروتر درجہ کی صورت کے لئے جو محل بنایا گیا تھا اس کو توڑ دیا جائے، اور نئی صورت کے لئے اس کے مناسب حال محل طیار کیا جائے۔

۴۔ اجزائے عالم کے حق میں قانون ارتقار کی ہمہ گیری کو جس شخص نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے،

اس کے نزدیک یہ بات ہرگز مستبعد نہیں ہے کہ یہی قانون اس پورے نظام عالم پر بھی حاوی ہو۔ اس وقت جو نظام عالم ہم دیکھ رہے ہیں، اس کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب سے خلق و ابداع کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے یہی مخصوص نظام اپنے انہی قوانین کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس سے پہلے نہ معلوم کتنے اور نظامات گذر چکے ہونگے جن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی عمر پوری کر کے دوسرے ترقی یافتہ نظام کے لئے جگہ خالی کر دی، اور ارتقا کے تدریجی مراتب سے گذر کر سلسلۂ وجود ہمارے اس نظام تک پہنچا۔ اسی طرح یہ نظام بھی کوئی آخری نظام نہیں ہے۔ یہ بھی جب اپنے امکانی کمالات کو پہنچ جائیگا، اور کمال کے بالاتر درجہ کو قبول کرنے کی استعداد اس میں باقی نہ رہے گی، تو اس کو توڑ دیا جائے گا، اور اس کے بجائے کوئی دوسرا نظام قائم کیا جائے گا جس کے قوانین کچھ اور ہوں گے، اور جس میں وجود کے کامل تر مراتب قبول کرنے کی صلاحیت ہوگی۔

۵۔ عالم کے موجودہ نظام پہ غور کرنے سے ہم کو بین طور پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ یہ ایک ناقص نظام ہے، اور مزید تکمیل کا محتاج ہے اس نظام میں اشیاء کی حقیقتیں، مادی آلایشوں سے اس درجہ آلودہ ہیں کہ حقیقتوں نے اوہام کا اور ان کے مادی لباسوں نے حقیقتوں کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ لطیف اور مادی آلایشوں سے مجرد ہے وہ اس نظام عالم میں اتنی ہی زیادہ مخفی و مستور، اور عقل و شعور کی دست رس سے دور ہے۔ یہاں ٹھوس مادی جسم وزن رکھتا ہے، اور لطیف و بسیط حقایق کا کوئی وزن نہیں ہے۔ یہاں لکڑی اور پتھر تو ناپے اور تولے جا سکتے ہیں، مگر عقل و فکر، خیال و رائے، نیت و ارادہ، جذبات و وجدانیات کو ناپنے اور تولنے کے لئے اس عالم کے قانون میں کوئی گنجایش نہیں ہے یہاں غلہ تولا جا سکتا ہے، مگر محبت اور نفرت کو تولنے والا کوئی ترازو نہیں ہے یہاں کپڑا ناپا جا سکتا ہے، مگر بغض و حسد کو ناپنے کے لئے کوئی پیمانہ موجود نہیں یہاں روپے پیسے کی قدر تو متعین کی جا سکتی ہیں۔ مگر اس جذبے کی قدر و قیمت متعین کرنا ممکن نہیں ہے جو سخاوت یا بخل کے لئے محرک

ہوتا ہے۔ یہ اس عالم کے نظام کا نقص ہے۔ عقل چاہتی ہے کہ اس نظام سے زیادہ ترقی یافتہ کوئی اور نظام ہو جس میں حقیقتیں مادی لباسوں کی محتاج نہ رہیں، اور بے نقاب جلوہ گر ہو سکیں۔ جس میں لطافتیں، کثافتوں پر غالب آجائیں، اور جو کچھ اب مستور و مخفی ہے، وہ نمایاں اور جلی ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی اس عالم کا نقص ہے کہ یہاں مادی قوانین کا غلبہ ہے جس کی وجہ سے افعال کے صرف وہی نتائج مرتب ہوتے ہیں جو مادی قوانین کے مقتضیات سے مطابقت رکھتے ہیں، اور ایسے نتائج مترتب نہیں ہونے پاتے جو مقتضیاتِ عقل و حکمت کے مطابق ہوں۔ یہاں آگ لگاؤ تو ہر آتش پذیر شے جل جائے گی، پانی ڈالو تو نمی کو قبول کرنے والی ہر شے بھیگ جائے گی، اگر نیکی کرو تو اس کا پھل نیکی کی صورت میں ظاہر نہ ہوگا جو اس کا حقیقی عقلی نتیجہ ہے، بلکہ اُس صورت میں ظاہر ہوگا جو مادی قوانین کے تحت ظاہر ہو سکتا ہے خواہ وہ نیکی کے بالکل برعکس بدی ہی کی صورت کیوں نہ ہو۔ اس نقص کو دیکھ کر عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس نظام کے بعد کوئی اور ترقی یافتہ نظام ایسا قائم ہو جس میں مادی قوانین کے بجائے عقلی قوانین جاری ہوں اور افعال کے وہ حقیقی نتائج ظاہر ہوں جو اس نظام میں مادی قوانین کے غالب ہونے کی وجہ سے ظاہر نہیں ہوسکے ہیں۔

نظامِ عالم کا خاتمہ ان مقدمات کو سمجھ لینے کے بعد اب دیکھیے کہ قرآن حکیم نے قیامت اور نشاءۃ آخرت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں آپ کے سوال کا کیا جواب ملتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى (۴۶:۱)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو چیزیں ہیں ان سب کو مقتضائے حکمت کے مطابق اور ایک مدت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۳:۱)

اس نے چاند سورج کو اپنے قانون کا پابند کر دیا۔ یہ سب ایک مدت مقررہ تک کے لئے چل رہے ہیں۔

پھر وہ قیامت کی کیفیت اس طرح بیان کرتا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۔ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ۔ (۸۲) ۔	جب آسمان پھٹ جائے گا اور کواکب منتشر ہو جائینگے اور سمندر پھوٹ نکلیں گے اور قبریں اکھاڑ دی جائیں گی ۔
اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۔ (۸۱ : ۱۔)	اور جب آفتاب کو لپیٹ دیا جائیگا اور تارے درہم برہم ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے ۔
فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۷۷ : ۱) ۔	پھر جب تارے ماند پڑ جائیں گے اور جب آسمان شق کر دیا جائے گا ۔ اور جب پہاڑ اڑا دئے جائیں گے
فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۷۵ : ۱)	جب آنکھیں پتھرا جائیں گی اور چاند گہنا جائیگا ۔ اور چاند سورج ملا دئے جائیں گے ۔
وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۔ (۶۹ : ۱)	زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ٹکرا دیا جائیگا اور ایک ہی ٹکر میں وہ پاش پاش ہو جائیں گے ۔
يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ (۱۴ : ۷)	جس روز زمین بدل کر دوسری طرح کی زمین کر دی جائے گی اور اسی طرح آسمان بھی، اور سب کے سب خدائے واحد قہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے

یہ سب اشارات ہیں اس طرف کہ اس نظام عالم کی ایک خاص عمر مقرر ہے۔ یہ کوئی دائمی نظام نہیں ہے جب اس کی عمر پوری ہو جائے گی تو یہ نظام درہم برہم کر دیا جائے گا۔ سورج، زمین، چاند، اور دوسرے سیارے جو اس نظام کے ارکان ہیں، اور جن کی گردشوں سے اس نظام کا قیام ہے منتشر ہو جائیں گے، ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے، اور یہ عارضی عمارت توڑ ڈالی

جائیگی۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عالم وجود کا خاتمہ ہو جائیگا یا خلق و ابداع کا سلسلہ بند کر دیا جائیگا بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ وجود کا یہ خاص طور جو اس نظام میں نظر آ رہا ہے، بدل ڈالا جائے گا، اور پھر عالم وجود کے لئے ایک دوسرا نظام قائم کیا جائیگا جس کی طرف يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ میں اشارہ کیا گیا ہے

حیاتِ اُخروی کا نظام کیا ہوگا وہ نظام کیسا ہوگا؟ اس کی جو کیفیت قرآن میں بیان کی گئی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ نظام ہی کے نقص کی تکمیل ہے اسی نظام کی ارتقائی صورت ہے، اور ویسی ہی ہے جیسی عقل چاہتی ہے کہ ہو۔ اس نظام میں وزن اور پیمائش اور حساب سب کچھ ہوگا۔ مگر مادی چیزوں کے لئے نہیں بلکہ لطیف، بسیط اور مجرد حقیقتوں کے لئے۔ وہاں خیر اور شر، ایمان اور کفر، اخلاق اور ملکات کا وزن ہوگا، نیتوں اور ارادوں کی پیمائش ہوگی۔ دلوں کے اعمال ناپے اور تولے جائیں گے۔ وہاں اس روٹی کے وزن اور اس پیسے کے عدد کا حساب نہ ہوگا جو آپ نے کسی غریب کو دیا ہے بلکہ اس نیت کا حساب ہوگا جو اس بخشش کے لئے محرک ہوئی ہے، اس لئے کہ وہاں کا قانون مادی نہیں، عقلی ہوگا۔

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (۱۷:۴)

آنکھ اور کان اور دل سب سے پوچھ گچھ ہوگی۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِينَ۔ (۲۱:۴)۔

اور قیامت کے روز ہم ٹھیک وزن کرنے والے ترازو رکھ دیں گے پھر کسی نفس پر کچھ ظلم نہ ہوگا اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا تو ہم اس کو لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ

اس روز ٹھیک ٹھیک وزن ہوگا پھر جس کے اعمال

مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۷ : ۱)

کا وزن بھاری ہوگا وہی فلاح پانے والا ہوگا اور جس کے اعمال کا وزن ہلکا ہوگا وہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپکو خود نقصان میں ڈالا۔

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۔ (۹۹)

اس روز لوگ جُدا جُدا نکلیں گے تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھیگا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھیگا۔

اس دوسرے نظام میں وہ سب چیزیں نمایاں ہوجائیں گی جو اس مادی نظام میں مادی قوانین کی تہوں کے سبب سے چھپی ہوئی ہیں۔ وہاں مخفی اور مستور حقیقتیں بے نقاب سامنے آجائیں گی اور ہر چیز کی اصلی اور حقیقی حیثیت کھل جائیگی۔

لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ (۵۰ : ۲)

انسان سے کہا جائیگا کہ تو اس چیز سے غفلت میں تھا اب ہم نے تیری آنکھوں پر سے پردہ اٹھادیا اور اب تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

یَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰی مِنْكُمْ خَافِیَةٌ (۶۹ : ۱)

اس روز تم پیش کئے جاؤگے تمہارا کوئی راز مخفی نہ رہے گا۔

وہاں افعال کے وہ حقیقی نتائج مترتب ہوں گے جو عقل و حکمت اور عدل و انصاف کے مطابق ہیں۔ موجودہ نظام کے مادی قوانین اور مادی اسباب و وسائل جن کے اثر سے افعال کے حقیقی اور عقلی نتائج مترتب نہیں ہوسکتے، وہاں نافذ نہیں ہوں گے، اس لئے وہ تمام چیزیں جو یہاں عدل و انصاف میں مانع ہوتی ہیں، اور صحیح نتائج مترتب نہیں ہونے دیتیں، وہاں بالکل بے اثر

ہوجائیں گی۔ مثال کے طور پر یہاں دولت، مادی وسائل کی کثرت، دوستوں اور حامیوں کی طاقت، سعی سفارش، خاندانی اثرات، خود اپنی چالاکی وہوشیاری اور ایسی ہی دوسری چیزیں انسان کو اس کے بہت سے افعال کے نتائج سے بچا لیتی ہیں۔ مگر وہاں ان اسباب کی تاثیریں باطل ہوجائیں گی اور ہر فعل کا وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو عدل اور حق کی بنا پر برآمد ہونا چاہیے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ (۱۰:۳)	وہاں ہر نفس اپنے اعمال کو خود جانچ لے گا جو پہلے سے بھیج چکا ہے
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔ (۳:۳)	ہر نفس کو جیسا اس نے کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔
يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ (۳:۳)	وہ دن جب کہ ہر نفس ہر اس نیکی کو جو اس نے کی ہے اور ہر اس برائی کو جو وہ کرچکا ہے حاضر پائیگا۔
وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲:۶)	ڈرو اس دن سے جبکہ ایک نفس دوسرے نفس کے کچھ کام نہ آئیگا، اور نہ اس کے حق میں کوئی سفارش قبول کیجائے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائیگا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جاسکیگی۔
فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ (۲۳:۶)۔	پھر جب صور پھونکا گیا تو اس روز ان میں کوئی نسبی تعلق باقی نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ جن کے اعمال کا پلہ بھاری ہوگا وہی لوگ فلاح پائیں گے اور جن کے اعمال ہلکے ہوں گے وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے خود اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا۔
يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى	وہ دن جبکہ نہ مال کچھ نفع دیگا اور نہ اولاد، نجات صرف

اللہ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۲۶: ۵)۔ | اس کی ہوگی جو خدا کے پاس قلب سلیم کے ساتھ حاضر ہوگا۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِکُمْ وَمَا نَرٰی مَعَکُمْ شُفَعَآءَکُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْکُمْ شُرَکٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَکُمْ وَضَلَّ عَنْکُمْ مَّا کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ (۶: ۱۱)۔

تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جیسا ہم نے تم کو پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا ہم نے تم کو جو کچھ ساز و سامان دیا تھا اس سب کو تم پیچھے چھوڑ آئے ہو اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم اپنی پرورش اور رزق بخشی میں خدا کا شریک سمجھتے تھے۔ تمہارے درمیان سب رابطے ٹوٹ چکے ہیں اور باطل ہو چکے ہیں۔

لَنْ تَنْفَعَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَفْصِلُ بَیْنَکُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۶۰: ۱)

قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد تمہارے لئے کچھ بھی نافع نہ ہوگی۔ اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے۔

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ لِکُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ (۸۰)۔

وہ دن جبکہ آدمی اپنے بھائی اور ماں باپ اور بیوی اور بچوں سے بھاگے گا۔ اس روز ہر شخص اپنے اپنے حال میں مبتلا ہوگا۔

موجودہ نظام میں یہ نقص ہے کہ یہاں قدرت کے انعامات کی تقسیم انسان کے علم اور عمل کی خوبی پر منحصر نہیں ہے بلکہ وہ ایسے اسباب پر مبنی ہے جن میں ذاتی اعمال اور نفسی صلاحیتیں محض ایک سبب کی حیثیت رکھتی ہیں اور دوسرے قوی تر اسباب ان کی تاثیر کو ضعیف بلکہ بسا اوقات بالکل زائل کر دیتے ہیں اس وجہ سے انعامات کی تقسیم میں استحقاق ذاتی کو دخل نہیں ہوتا یا ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ یہاں ایک شخص تمام عمر ظلم اور فسق کرنے کے باوجود خوشحالی اور دنیوی برکات سے متمتع ہو سکتا ہے، اور ایک شخص زندگی بھر پاکبازی اور پرہیزگاری کے ساتھ بسر کرنے کے باوجود خستہ حال اور دنیوی

مصائب سے پراگندہ بال رہ سکتا ہے۔ یہ نقص تکمیل کا محتاج ہے۔ اور حکمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ موجودہ نظام ترقی کر کے ایک ایسے نظام میں تبدیل ہو جائے جس میں عدل کے ساتھ جزا و سزا کی تقسیم ہو اور ہر شخص کو وہی ملے جس کا وہ اپنے ذاتی حسن و قبح کی بنا پر مستحق ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ دار آخرت کا نظام ایسا ہی ہوگا۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (۳۸:۳)	کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کو انہی جیسا بنا دیں گے جو زمین میں فساد کرتے ہیں؟ کیا ہم متقیوں اور فاجروں کو یکساں کر دیں گے۔
أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۴۵:۲)۔	کیا بدکاریاں کرنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ایمان لانے والوں کے برابر کر دیں گے اور ان کی زندگی و موت یکساں ہوگی؟ یہ کیسی بری بات ہے جس کا وہ حکم لگاتے ہیں۔
وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا (۶:۱۱)	ہر ایک کے لئے ویسے ہی درجات ہونگے جیسے انہوں نے عمل کیے۔
وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ ۔ (۲۶:۵)۔	جنت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے سامنے کر دی جائے گی۔

یہ ہے اس دوسرے جہان کا نقشہ جس کو اس جہان کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کا مذہب اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب تجویز کرتا ہے جو لوگ اس جہان اور اس کے سارے کارخانے کو ایک کھیل ایک گھروندا ایک بے مقصد و بے حاصل ہنگامہ اور ایک ایسا اہل گورکھ دھندا سمجھتے ہیں جو اہمال شروع ہوا اور اہمال ہی میں ختم ہو جائے گا، ان کو تو اس تجویز اور اس کے دلائل و شواہد میں کوئی بات قابل

تسلیم نظر نہ آئے گی۔ مگر جو شخص نظام عالم کو خدا کا آفریدہ سمجھتا ہے، اور خدا کو حکیم مانتا ہے وہ ان دلائل پر غور کرنے کے بعد یقیناً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ موجودہ نظام عالم کے بعد اس طور اور اس کیفیت کے ایک نظام کا ہونا ضروری ہے۔ اور جب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ممکن ہے! تو اس ممکن کی ضرورت کا ثابت ہوجانا، اس بات پر ایمان لانے کے لئے بالکل کافی ہے کہ خدائے حکیم و دانا اس ممکن ضروری الوجود کو ضرور وجود بخشے گا۔

اس بحث سے واضح ہوگیا کہ اسلام نے جس حیات اخروی پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے وہ بعید از عقل نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ عین مقتضائے عقل و حکمت ہے، اور علم و عقل کی کسی ترقی سے اس ایمان میں رخنہ نہیں پڑ سکتا، بشرطیکہ وہ ترقی حقیقی ہو نہ کہ سطحی اور نمائشی۔

(باقی)

کتب سماوی پر ایک نظر
(۷)
عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

از جناب رفیق شاہ صاحب

انگریزی اناجیل انجیلوں کی قلت اور کمیابی کا زمانہ جاتا رہا۔ یہ کتابیں اب بہت کثرت سے شایع ہونے لگی ہیں اور دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں لیکن آج کل انگریزی زبان نے دنیا میں جو پھیلاؤ اختیار کر رکھا ہے اس کی بنا پر بائبل پر تبصرہ پورا نہ ہوگا اگر اس کے انگریزی ترجمہ کی تاریخ پر بھی نظر نہ ڈالی جائے۔ اس کا کچھ تھوڑا سا ذکر توریت کے تحت میں بھی آچکا ہے

انگلستان میں انگریزی ترجمہ کے لحاظ سے بھی انجیل پر دو دور گذر چکے ہیں ایک قبل ایجاد طباعت قلمی نسخوں کا دور۔ دوسرا بعد ایجاد طباعت مطبوعہ بائبلوں کا دور۔

دور اول میں ساتویں صدی عیسوی تک انجیل کے بعض حصوں کے ترجمے نظم میں کیے جاتے تھے آٹھویں صدی میں نثر میں ترجموں کی ابتدا ہوئی مگر یہ ترجمے بھی بائبل کے متفرق اجزا کے ہوتے تھے۔ چودہویں صدی کے وسط تک پوری بائبل کا کوئی مکمل ترجمہ انگلستان میں نہیں ہوا۔ سب سے پہلا مکمل ترجمہ بائبل کا انگلستان میں انگریزی زبان میں وکلف (Wycliffe) نے تقریباً ۱۳۸۲ء میں انجام کو پہنچایا۔ اس کے ساتھ اس کام میں قابل لوگوں کی ایک جماعت بھی شریک رہی جن میں سے ایک شخص کا نام نکولاز (Nicholas) تھا۔ وکلف ان لوگوں میں سے تھا جو اس امر پر زور دیا کرتے تھے کہ پادریوں نے جو اہمیت حاصل کر رکھی ہے اور لوگوں کے دین و ایمان کے مالک بن بیٹھے ہیں اس کا انھیں کوئی حق حاصل نہیں انجیل خدا کا کلام ہے اور ہر شخص کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔ ہر شخص خدا کے احکام براہ راست انجیل سے معلوم کر سکتا ہے

ظاہر ہے کہ ایسا شخص پادریوں کی نگاہ میں مقبول نہیں ہو سکتا چنانچہ اس ترجمہ پر پادریوں نے شور مچادیا کہ ترجمہ غلط اور گمراہ کن ہے۔ وکلف نے اس شور و واویلا کی پروانہ کی اور اس نے اور اس کی جماعت کے لوگوں نے مردانہ وار اس مخالفت کا مقابلہ کیا۔ ۱۳۹۵ء اور ۱۳۹۷ء کے درمیان جماعت وکلف نے پہلے ترجمہ پر نظر ثانی کی اور اس پر ایک مقدمہ کا بھی اضافہ کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دوسرا ترجمہ جان پروی John Purvey کی نظر ثانی کا نتیجہ ہے اور مقدمہ بھی اسی کا لکھا ہوا ہے اور یہ سب کچھ اس نے وکلف کے انتقال ۱۳۸۴ء کے بعد کیا۔ پہلا ترجمہ بیشتر لفظی تھا اور دوسرا ترجمہ با محاورہ۔ یہ چودھویں صدی کا کارنامہ تھا۔ پندرہویں صدی میں بائبل کی کوئی خدمت نہ ہوئی بلکہ حکومت کی جانب سے کتب مقدسہ کی اشاعت اور ترجمہ کرنے والی جماعتوں پر سختیاں توڑی گئیں اور پادریوں کی جہل پرور نفسانیت کا غلبہ رہا۔ چودھویں صدی میں انگلستان میں ریفارمرز یعنی مجددین مذہب کی ایک جماعت لالرڈس (Lollards) کے نام سے پیدا ہو گئی تھی اور وکلف جان پروی اور سر جان اولڈکیسل وغیرہم اسی جماعت کے پیشوا اور رہبر تھے پندرہویں صدی میں اس جماعت کو ایسا نیست و نابود کردیا گیا کہ آج انکا کوئی نشان تک باقی نہیں۔ اس جماعت کے زبردست اور معزز سرگروہ سرجان اولڈکیسل (Sir John Oldcastle) کو اس سرپرستی کی جرم میں مرتد قرار دیکر زندہ جلادیا گیا۔

ایجاد طباعت کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے مگر اس دور کے شروع ہونے کے بعد بھی انگلستان بہت عرصہ تک سوتا رہا۔ فن طباعت کی ایجاد ۱۴۴۰ء میں وقوع میں آئی ۱۴۶۶ء تک جرمنی میں بائبل کے ترجمہ کی طباعت و اشاعت ہو چکی تھی اور لوتھر کی اصلاحی جدوجہد کے آغاز سے قبل یعنی تقریباً ۱۵۲۱ء سے پہلے وہاں وہ کتاب سترہ (۱۷) مرتبہ اور چھپ چکی تھی۔ ہینری ہشتم کے تخت انگلستان پر آنے سے قبل یعنے ۱۵۰۹ء سے بہت پیشتر فرانس اسپین اٹلی بوہیمیا اور ہالینڈ میں بائبل کے ملکی زبانوں میں ترجمے طباعت کے ذریعہ شائع ہو چکے تھے۔ مگر انگلستان میں ۱۵۲۳ء سے قبل طباعت انجیل کا اہتمام ناممکن رہا۔ اس سے قبل انگلستان کے ایک فاضل ولیم ٹنڈیل William Tyndale

نے اپنے ہموطنوں کو مضامین بائبل سے آگاہ کرنے کے شوق میں انجیل کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا اور کئی برس تک اسی جد وجہد میں رہا مگر اس کام کے لئے انگلستان کی زمین کو اُس نے اپنے لئے تنگ پایا اور اپنی جان بچا کر ممالک غیر میں بھاگ گیا اور ۱۵۲۴ء میں پہلے ہیمبرگ میں پھر وٹن برگ میں پناہ گزین ہوا اور اپنے ترجمے کے کام میں مصروف رہا۔ ۱۵۲۵ء میں مقام کلون میں اُس نے عہد جدید کا ترجمہ چھپوانا شروع کیا۔ مگر ریفارمیشن کے دشمن جان کاکلیس نے طباعت انجیل کے کام کو موقوف کرا دیا اور انگلستان کے شاہ کو کہلا بھیجا کہ یہ زہریلے اوراق اُس ملک میں داخل نہ ہونے پاویں۔ ٹنڈیل یہاں سے بھی بھاگ کر مقام ورمس میں پہنچا جہاں اُس نے اپنے کام کو جاری رکھکر کسی نہ کسی طرح انجام پر پہنچا یا اور ۱۵۲۶ء کے اختتام سے قبل اپنے مطبوعہ ترجمہ کو انگلستان میں داخل کر دیا۔ انگلستان میں یہ نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونا شروع ہوگئے۔ اس کا حکومت کی جانب سے یہ انعام ملا کہ جتنے نسخے مل سکے وہ سب کے سب بر سر بازار جلا دئے گئے۔ مگر ٹنڈیل مردانہ وار اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے اپنے ترجمے کے متعدد ایڈیشن ہر مرتبہ نظر ثانی کے بعد نکالے اور سب سے آخری ایڈیشن اینٹورپ سے ۱۵۳۵ء میں نکلا جس کا ایک نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں اور ایک نسخہ اکسفورڈ ایگزیٹر کالج میں آج بھی موجود ہے۔ مگر اس کارنامے کے بعد ٹنڈیل گرفتار کر لیا گیا قید میں رکھا گیا اور بالآخر ۶ اکتوبر ۱۵۳۶ء کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا اور اس کی نعش کو جلا دیا گیا۔ تماشہ کی بات تو یہ ہے کہ ۱۵۳۸ء میں انگلستان میں پوری بائبل پہلی مرتبہ طبع ہوئی وہ ٹنڈیل ہی کی ترجمہ کی ہوئی بائبل کی طبع جدید تھی۔ ڈاکٹر ویسٹکوٹ اپنی کتاب تاریخ انگریزی بائبل کے صفحہ ۳۱۶ پر لکھتے ہیں کہ:

"انگریزی بائبل کی تاریخ کی ابتدا ٹنڈیل کے کارناموں سے ہوتی ہے نہ کہ کلف کے کارناموں سے"۔

تقریباً اسی زمانہ میں مائلس کورڈیل Miles Coverdale نے بھی ایک ترجمہ چھپوایا اور یہ ترجمہ بھی انگلستان سے باہر چھپا۔ یہ شخص ٹنڈیل ہی کی جماعت کے لوگوں میں سے تھا اس نے

اپنے ترجمہ میں لوتھر کی تفسیر سے بہت مدد لی۔

ٹنڈیل اور کوورڈیل کے نسخوں کی مقبولیت دیکھکر انگلستان کے کتب فروشوں کے منہ میں بھی پانی آگیا اور انہوں نے خیال کیا کہ انجیل کے ترجموں کی طباعت واشاعت دولتمند بننے کا نہایت اچھا ذریعہ ثابت ہوگی چنانچہ چاروں طرف سے ترجموں کا شور مچنا شروع ہوگیا۔

جان راجرس (John Rogers) نے ٹامس میتھیو (- Thomas Matthew) کے نام سے طباعت ایک نہایت نفیس ترجمہ شائع کیا جو میتھیوز بائیبل Matthew's Bible) کے نام سے موسوم ہے مگر اس بیچارہ کا حشر بھی یہ ہوا کہ اُسے گرفتار کرکے زندہ جلا دیا گیا اس کے بعد رچرڈ ٹریورنز (Richard Traverner) نے ادہر ادہر کے ترجموں سے چوری کرکے ایک ترجمہ نکالا مگر یہ کچھ مقبول نہ ہوا۔

اب تک جتنے ترجمے شائع ہوئے تھے وہ افراد کی جانب سے تھے اور نجی طور پر شائع ہوئے تھے۔ نہ حکومت کو اُن میں کوئی دخل تھا نہ پادریوں کو اُن سے کوئی سروکار ۱۵۳۹ء میں پادریوں اور بشپوں نے بڑے پیمانوں پر اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی جانب سے ایک مستند ترجمے کے طبع کرانے کا انتظام کیا اور اُس کا نام وی گریٹ بائیبل (The Great Bible) رکھا۔ پادریوں کے اس گروہ کے سرغنا ٹامس کرینمر (Thomas Cranmer) آرچ بشپ آف کینٹربری یعنی انگلستان کے لاٹ پادری تھے۔ مترجموں کی ایک جماعت مرتب کی گئی جس کے سرغنا کورڈیل بنائے گئے اور ترجمہ کی بنیاد میتھیوز بائیبل کو قرار دیا گیا۔ ترجمہ کا کام پیرس میں شروع اور لندن میں ختم کیا گیا۔ طباعت کے لحاظ سے اور نمائشی اعتبار سے یہ بائیبل اپنے زمانہ میں بینظیر تھی۔ ۱۵۳۹ء سے ۱۵۴۱ء تک اس کتاب کے سات ایڈیشن نکل چکے تھے دوسرے ایڈیشن میں جو ۱۵۴۰ء میں نکلا ایک طویل دیباچہ آرچ بشپ کرینمر کے قلم کا لکھا ہوا شامل کیا گیا اور اس بنا پر اس کا نام کرینمرز بائیبل پڑگیا۔

اس وقت ایک طرف تو مذہبی بیداری کا یہ عالم تھا کہ اناجیل کے ترجموں پر ترجمے شائع ہو رہے تھے حتیٰ کہ پادریوں کی جماعت تک نے ایک مستند ترجمہ شائع کر دیا تھا اور دوسری طرف حکومت کی طرف سے یہ برتاؤ ہو رہا تھا کہ احکام صادر ہو رہے تھے کہ ٹنڈیل کا ترجمہ کوئی نہ پڑھے کورڈیل کی بائیبل کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ دوسرے ترجموں سے نوٹ اور حواشی خارج کر دئے جائیں۔ کوئی معمولی عورت، مزدور، قلی، کسان کاشتکار، خدمتگار، کاریگر، مسافر بائیبل کے کسی حصہ کو نہ پڑھے نہ اسے کسی اور کام میں لائے نہ اس پر عمل کرے، ورنہ سزائے جرمانہ یا قید کا مستوجب ہوگا۔ گریٹ بائیبل کے موجد آرچ بشپ کرینمر زندہ جلا دئے گئے۔ جان راجرس ان سے قبل ہی ختم کر دیے گئے تھے۔ کورڈیل اور ان کے ہم مشرب ساتھی اپنی جان بچا کر بھاگے اور جینوا میں پناہ گزیں ہوئے۔ اس وقت جینوا میں کالون اور بیزا بھی مقیم تھے جو اپنے زمانہ کے مشہور مصلح عیسویت اور ریفارمر تھے۔ یہاں ان لوگوں کو بلا کرا اپنا کام جاری رکھنے کی خاصی مہلت ملگئی۔ چنانچہ انھوں نے پھر ترجموں پر نظر ثانی کرکے بائیبل کا ایک جدید ایڈیشن نکالا۔ جینوا میں آکر ان لوگوں کی محنت کا پہلا ثمرہ یہ نکلا کہ جون ۱۵۵۷ء میں عہد جدید کا ایک نیا ایڈیشن نکلا جس میں کالون کا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی شامل تھا اور آیات و ابواب کی تقسیم بھی کی گئی تھی اناجیل میں یہ آیات و ابواب کی پہلی تقسیم تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس تقسیم کے کرنے میں دوسری زبانوں کی اناجیل کی پیروی کی گئی ہے۔ علاوہ اس کے اس نسخہ میں حواشی بھی تھے۔ بعض لوگ کالون کی اس کارگذاری کو ولیم وہٹنگم (William Whittingham) سے منسوب کرتے ہیں۔

اس کے بعد جینوا ہی سے ۱۵۶۰ء میں بائیبل کا ایک مکمل ایڈیشن نکالا گیا جس میں عہد عتیق اور عہد جدید دونوں شامل تھے اور عہد عتیق میں بھی مثل عہد جدید مذکورۃ الصدر کے آیات و ابواب کی تقسیم کر دی گئی تھی حواشی بھی درج تھے۔ اس کی طباعت کے مصارف اہل جینوا نے برداشت کئے تھے اس لئے اس کا نام جینوا بائیبل پڑ گیا۔ اس نسخہ کے خاص مؤلف ولیم وہٹنگم (William Whittingham

اینٹونی گلبی (Anthony Gilby ، اور ٹامس سیمپسن (Thomas Sampson

بیان کئے جاتے ہیں۔ یہہ نسخہ بہت مقبول ہوا اور گریٹ بائبل پر بھی فوقیت لے گیا۔ آرچ بشپ میتھو پارکر

(Archbishop Matthew Parker) نے سنہ ۱۵۶۸ء میں جینوا بائبل پر نظر ثانی

کرکے اور چند حواشی کا اضافہ کرکے ایک جدید بائبل بنائی اور اس کا نام بشپس بائبل (Bishops' Bible) رکھا مگر مقبولیت عام میں یہ جینوا بائبل پر سبقت نہ لیجا سکی۔

ٹنڈیل کے زمانے سے لیکر اس وقت تک جتنے ترجمے شائع ہوے سب اصلاح پسند لوگوں کے کئے ہوے تھے۔ اب قدامت پسند رومن کیتھولکس کو بھی میدان میں آنے کا شوق ہوا چنانچہ "غلط ترجموں کے ذریعہ لوگوں کے عقاید کی خرابی کی روک تھام" کی غرض سے اونہوں نے بھی ایک ترجمہ کر ڈالا جو رومن ترجمہ ولگٹ کا لاطینی آمیز انگریزی ترجمہ ہے۔

انقلاب زمانہ کی اس سے عجیب تر مثال کیا ہوگی کہ جو حکومت پارلیمنٹری احکام کی قوت سے انجیل کے ترجموں کو جلا ڈالتی تھی، ترجمہ کرنے والوں کو قتل کر دیتی تھی اور انجیل پڑھنے والے عوام الناس کو قید کرتی تھی وہ آج خود بائبل کا ترجمہ بڑے اہتمام سے کرتی ہے۔ بادشاہ انگلستان شاہ جیمس اول جنوری سنہ ۱۶۰۴ء میں تخت انگلستان پر بیٹھتا ہے اور چند ہی ماہ بعد ہیمپٹن کورٹ کے محل میں ہر طبقہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کے پادریوں کی کانفرنس کرتا ہے، خود اس کا صدر بنتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ بائبل کا ایک مستند ترجمہ کیا جائے۔ بہترین اشخاص اور اعلی ترین تعلیم کے لوگ بہترین تحقیق یا ان میں ترجمہ کریں۔ سب پادری اور بشپ اس پر نظر ثانی کریں۔ پھر پریوی کونسل میں وہ پیش ہو۔ اس کے بعد مہر شاہی اس پر ثبت ہو اور سارا چرچ اس کا اور صرف اسی کا مطیع ہو جائے گویا فرمان خداوندی کو ایک عاجز دنیوی بادشاہ کی منظوری کا (نعوذ باللہ) محتاج بنا دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔ سنہ ۱۶۰۷ء میں کام شروع ہوتا ہے اور سنہ ۱۶۱۱ء میں کتاب چھپکر تیار ہو جاتی ہے۔ دی آتھرائزڈ (The Authorized Version) یعنی مستند ترجمہ اور کنگ جیمس بائبل (King

Jame's Bible (یعنی خدا کی نہیں بلکہ شاہ جیمس کی بائبل اس کا نام رکھا جاتا ہے) مگر حقیقت یہ ہے کہ ۱۵۶۸ء کی بشپس بائبل (Bishops, Bible) پر نظر ثانی کے سوا اس میں اور کچھ نہیں۔ اس مستند ترجمہ پر عیسائی علماء ہی کی جانب سے جس کثرت اور بشدت سے اعتراضات ہوتے رہے ہیں ان کی جانب اشارہ ہم اپنے مضمون نمبر ۲ میں کر چکے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع جدید سنہ ۱۹۲۹ء جلد ۳ میں زیر عنوان "بائبل" صفحہ ۵۳۴ پر صاف اعتراف کیا گیا ہے کہ:- باوجود اس کے یعنی باوجود اس خوبی کے جس سے کہ یہ ترجمہ کیا گیا ہے، ترجمہ کی اصلاح اور بہتری کا کام صدیوں سے اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ اس مستند ترجمہ کی جدید اشاعت کا مقابلہ ۱۶۱۱ء کی اصلی اشاعت سے کیا جائے تو بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔" اصلاح و بہتری کی یہ کوششیں تو صدیوں تک جاری رہیں گی مگر ان سے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔ اس مستند ایڈیشن کے بعد اس کام میں بعض امریکہ والوں کی بھی شرکت ہوگئی اور ۱۸۸۱ء میں عہد جدید اور ۱۸۸۴ء میں عہد عتیق کا نظر ثانی کیا ہوا نسخہ ریوائزڈ ورشن (The Revised Version) کے نام سے بھی نکل چکا ہے مگر خود عیسائی علماء کی بھی تسکین اس سے نہ ہوئی اور وہ اب تک تحقیق و تنقید و تفتیش کی ضرورت کو محسوس کئے جا رہے ہیں۔ منصف مزاج محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ ۱۲۰ء سے بائبل کے اصل عبرانی متن سے کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ چوتھی صدی میں سینٹ جروم نے یونانی ترجمہ سے اپنا لاطینی ترجمہ کیا اور اس لاطینی ترجمے سے رومی ولگٹ مرتب ہوا اور رومی ولگٹ سے یورپ کی تمام بقیہ زبانوں میں ترجمہ ہوا جس میں انگریزی زبان بھی شامل ہے۔ اور اس بات کا سب کو اعتراف ہے کہ بائبل کا اصلی اور سچا نسخہ اب دنیا سے مفقود ہے پس قصہ ختم شد۔ ظنیات کی بناء پر صحت کے متعلق اطمینان محال ہے۔

خصوصیات تعلیمی

اب تک کتب عہد جدید کے بحیثیت مجموعی معتبر یا غیر معتبر ہونے سے بحث تھی اب ان کتب وحی کی تعلیمی خصوصیات سے بحث کی جاتی ہے ضمناً اس امر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی کہ بعض تعلیمات حقیقتاً ہیں کیا اور انہیں علم کے طور پر کیا گیا ہے۔ اناجیل مروجہ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کوئی جدید شریعت لے کر نہیں آئے بلکہ

موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت کو قائم رکھنے اور اُسے یہودیوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے پاک صاف کرنے آئے تھے۔ گویا عیسویت موسویت ہی کا تتمہ ہے متی باب ۵ آیت ۱۷ تا ۲۰ میں خود عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول منقول ہے:

"یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں توریت کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ پورا ہوئے بغیر نہ ٹلیگا۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی حکم کو توڑیگا اور دوسروں کو توڑنے کی ہدایت کرے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا۔ لیکن جو ان پر عمل کرے گا۔ اور ان کی دوسروں کو تعلیم دیگا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائیگا۔ پس میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہو گی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکو گے۔"

متی باب ۲۳ آیہ ۱ تا ۳ میں منقول ہے کہ:-

"تب یسوع لوگوں اور اپنے شاگردوں سے کہنے لگا کہ فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں اس لئے وہ جو کچھ تمہیں ماننے کو کہیں مانو اور عمل میں لاؤ لیکن اُن کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں مگر کرتے نہیں۔"

جب یہ ثابت ہو گیا کہ عیسویت موسویت کی ناسخ نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے ہر حکم کی تعمیل عیسائیوں پر فرض ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متبعین کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اس شریعت کے جس حکم کو چاہیں مانیں اور جسے نہ چاہیں نہ مانیں تو عیسوی تعلیمات کی خصوصیات دریافت کرنے کے لئے ضروری ہو گیا کہ توریت اور انجیل دونوں پر یکساں طور پر نظر ڈالی جائے۔ اناجیل میں توریت کی طرح احکام شریعت

کا نہ ہونا اس امر کی دلیل نہیں کہ عیسائی قیود شریعت سے آزاد ہیں۔ دیگر صحف انبیاء بنی اسرائیل بھی تورات احکام شریعت سے خالی ہیں مگر داؤد اور یرمیاہ اور یسعیاہ اور عزرا اور دانیال اور حزقیل اور یشوع اور سموائیل نے اپنے آپ کو احکام توریت کی تعمیل سے مستثنیٰ نہ رکھا بلکہ خود عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ان احکام کی حفاظت کی اور اپنی امت کو ان کی تعمیل کا حکم فرمایا اور بار بار حکم فرمایا۔ ان حالات میں عیسائیوں کا صرف مسیح پر ایمان لے آنا اور عملی اعتبار سے اپنے آپ کو شریعت کی پابندی سے آزاد رکھنا عیسوی نقطہ نظر سے بھی قابل اعتراض ہے۔

ایمان و عمل انجیل کی رو سے ایمان بلا عمل نجات کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ گلتیون کے باب ۴ آیہ ۴ میں ہے کہ:۔

"جب وقت پورا ہو تب خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا جو عورت سے پیدا ہو کے شریعت کے تابع ہوا"

۱۔ تمطاؤس باب ۵ آیہ ۸ میں ہے کہ:۔

"اگر کوئی اپنوں کی اور خاصکر اپنے ہی گھر کی خبر گیری نہ کرے تو ایمان سے منکر اور بے ایمان سے بدتر ہے"۔

گھر کی خبر گیری عمل ہے اور اس عمل سے غافل رہنا ایمان تک کی بربادی کا باعث بتلایا گیا ہے۔ عمل کی ضرورت اس سے ظاہر ہے۔

۲۔ تمطاؤس باب ۲ آیہ ۱۹ میں ہے کہ: "جو مسیح کا نام لیتا ہے بدی سے باز رہے" لوقا باب ۱۹ آیہ ۸ میں یہ واقعہ درج ہے کہ محصول لینے والوں کے سردار اور متمول شخص زکی نے جب کھڑے ہو کر مسیح سے کہا کہ "میں اپنا آدھا مال غریبوں کو دیتا ہوں اور اگر کسی کا کچھ دغابازی سے لیا ہے تو اس کا چوگنا دیتا ہوں" تو یسوع نے اس کے حق میں کہا کہ "آج اس گھر میں نجات آئی" یہاں بھی نجات کا انحصار عمل پر ہوا

متی باب ۷، آیہ ۲۱ تا ۲۴ میں ہے کہ:۔

"ہر ایک جو مجھے خداوند خداوند کہتا ہے آسمان کی بادشاہت میں شامل ہوگا مگر وہی جو میرے باپ کی جو آسمان پر ہے مرضی پر چلتا ہے۔ اُس دن بہتیرے مجھے کہیں گے اے خداوند اے خداوند کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے دیوں کو نہیں نکالا اور تیرے نام سے بہت سی کرامات ظاہر نہیں کیں۔ اس وقت میں ان سے صاف کہوں گا کہ میں کبھی تم سے واقف نہ تھا اے بدکارو میرے پاس سے دور ہو پس جو کوئی میری یہ باتیں سنتا اور انھیں عمل میں لاتا ہے میں اسے اس عقلمند آدمی کی مانند ٹھیراتا ہوں جس نے چٹان پر اپنا گھر بنایا۔"

متی باب ۱۶ آیہ ۲۷ میں قیامت کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ درج ہیں:۔

"ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آوے گا تب ہر ایک کو اُس کے اعمال کے موافق بدلا دیگا۔"

عہد عتیق اور عہد جدید کی متعدد کتابوں میں بکثرت اور بصراحت آیا ہے کہ قیامت کے دن اعمال نیک اور اعمال بد پر جزا و سزا مترتب ہوگی۔ لوقا کے باب ۱۰ میں ایک واقعہ درج ہے کہ کسی شریعت سکھلانے والے نے عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ میں کیا کروں جو نجات پاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ شریعت کے احکام بجا لا نجات اسی سے ہوگی۔ یوحنا باب ۱۴ آیہ ۱۵ میں ہے کہ:۔

"اگر تم مجھے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو۔" طیطس باب ۱ آیہ ۱۶ میں ہے کہ:۔

"خدا کے پہچاننے کا اقرار تو کرتے ہیں پر کاموں کی راہ سے اس کا انکار کرتے ہیں وے نفرت کے لائق اور نافرمانبردار ہیں۔ اور ہر ایک نیک کام کے لئے نامقبول۔" مکاشفات باب ۲۲ آیہ ۱۴ میں ہے کہ:

"مبارک وے ہیں جو اُس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں تاکہ زندگی کے درخت پر انکا اختیار ہو اور وے اُن

دروازوں سے شہر میں داخل ہوں مگر کتے اور جادوگر اور حرامکار اور خونی اور بت پرست اور جو کوئی جھوٹ کو چاہتا اور بولتا ہے سب باہر ہیں۔" یعقوب باب ۲ آیات ۱۴ تا ۲۶ بھی ملاحظہ ہوں:۔

اے میرے بھائیو اگر کوئی کہے کہ میں ایماندار ہوں اور عمل نہ کرتا ہو تو کیا فائدہ کیا ایمان اسے بچا سکتا ہے۔ اگر کوئی بھائی یا بہن ننگا ہوے اور روزینہ کی روٹی میسر نہ ہو اور تم میں سے کوئی انہیں کہے کہ سلامت جاؤ گرم اور سیر ہو پر تم انہیں وے چیزیں نہ دو جو بدن کو ضرور ہیں تو کیا فائدہ۔ اسی طرح ایمان بھی اگر عمل کے ساتھ نہ ہو تو وہ اکیلا ہو کر مردہ ہے لیکن شائد کوئی کہے کہ ایمان تجھ میں ہے اور میرے پاس اعمال بھلا تو اپنا ایمان بغیر اپنے اعمال کے مجھ پر ظاہر کر اور میں اپنے ایمان کو اپنے اعمال سے تجھ پر ظاہر کرونگا۔ تو ایمان لاتا ہے کہ خدا ایک ہے اچھا کرتا ہے۔ شیاطین بھی یہی مانتے ہیں اور تھرتھراتے ہیں۔ پر اے واہی آدمی کیا تجھکو معلوم ہوگا کہ ایمان بے اعمال کے مردہ ہے۔ کیا ہمارا باپ ابراہام اعمال سے راستباز نہیں ٹھیرایا گیا.....

پس تم دیکھتے ہو کہ آدمی اعمال سے راستباز ٹھیرایا جاتا ہے اور صرف ایمان سے نہیں ...... پس جیسا بدن بے روح مردہ ہے ویسا ہی ایمان بے اعمال مردہ ہے۔"

انجیل میں جہاں اقتباسات مندرجہ بالا کی رو سے ایمان کے ساتھ عمل کی ضرورت پر اس شدومد کے ساتھ زور دیا گیا ہے وہاں تماشہ کی بات یہ ہے کہ بعض کتب مقدسہ میں مثلاً پولوس کے رومیوں کے نام خط کے ابواب ۳ و ۴ و ۶ میں اور نیز پولوس کے گلتیوں کے نام خط کے باب ۵ میں یہ بھی لکھا ہے کہ صرف مسیح پر ایمان لانا نجات کے لیے کافی ہے اور اعمال خیر پر اعتماد محض بیوقوفی ہے اور شریعت پر چلنے والے لوگ مسیح سے جدا ہو جاتے ہیں اور سرے سے عیسائی ہی نہیں رہتے اور خدا کی رحمت سے مایوس ہیں۔ چنانچہ زمانہ حال کے مدعیان عیسویت کا مسلک بیشتر یہی پایا جاتا ہے۔ جن کتابوں میں تحریفات و الحاقات و اختلافات کا

ہونا مسلم ہو اُن میں اس قسم کے متضاد و متناقض مضامین کا پایا جانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں ۔

ایمان و عمل کے مسئلہ میں اس اختلاف کی ابتدا، پولوس کے زمانہ میں واقع ہوئی اور پولوسی جماعت ہی شریعت موسوی کی اس بے احترامی کی ذمہ دار ہے ۔ ابتدا میں حواریوں نے تبلیغ مذہب کا دائرہ صرف یہودیوں ہی تک محدود رکھا تھا ۔ پولوس اس زمانہ میں عیسویت کا سخت دشمن تھا ۔ اس نے حواریوں اور ان کے متبعین کو بڑی بڑی ایذائیں پہنچائیں جب وہ تائب ہو کر اپنی ان حرکتوں سے باز آیا اور دین عیسوی میں داخل ہوا تو برنباس کی ہمراہی میں اُس نے بھی تبلیغی امور میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنی تبلیغی کوششوں کو اقوام غیر یہود تک (جنہیں اس زمانہ میں "جنٹائل" کہتے تھے) پہنچایا ۔ ان کوششوں کی کامیابی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اس نے جو تدبیریں سوچیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ غیر یہود اقوام کے لوگوں میں سے جدید ایمان لانے والوں کو احکام توریت کی پابندی سے آزاد کر دیا جائے ۔ چنانچہ بیت المقدس کی مذہبی جماعت کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا ۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ عہد جدید کی کتاب اعمال، باب ۱۵ (از آیہ ۲۲ تا ۲۹) میں ان الفاظ میں درج ہے ۔

> تب رسولوں اور بزرگوں نے سارے کلیسیا سمیت بہتر جانا کہ اپنے میں سے کئی شخص چن کے پولوس اور برنباس کے ساتھ انطاکیہ میں بھیجیں ۔ یعنی یہوداہ کو جس کا لقب برسباس ہے اور سیلاس کو جو بھائیوں میں مقدم تھے ۔ اور ان کے ہاتھ یہ لکھ بھیجا کہ اُن بھائیوں کو جو غیر قوموں میں سے ہیں اور انطاکیہ اور شام اور کلکیہ میں رہتے ہیں رسولوں اور بزرگوں اور بھائیوں کا سلام ۔ از بسکہ ہم نے سنا ہے کہ ہم میں سے بعضوں نے جن کو ہم نے حکم نہیں کیا جا کر تمہیں اپنی باتوں سے گھبرا دیا ہے اور تمہارے دلوں کو یہ کہکے پریشان کر دیا ہے کہ ختنہ کرو اور شریعت پر چلو سو ہم نے باہم متفق ہو کر یہ بہتر جانا کہ اپنے عزیزوں برنباس اور پولوس کے ہمراہ جو کہ ایسے لو

جنہوں نے اپنی جان ہمارے خداوند یسوع مسیح کے نام پر خطرہ میں ڈالی بعض منتخب اشخاص کو تمہارے پاس بھیجیں ۔ چنانچہ ہم نے یہوداہ اور سیلاس کو بھیجا جو تمہیں زبانی بھی یہ باتیں بیان کریں گے کیونکہ روح القدس نے اور ہم نے بہتر جانا کہ ان ضروری باتوں کے سوا تم پر اور کوئی بات کا بوجھ نہ ڈالیں کہ تم بتوں کے چڑھاووں اور لہو اور گلا گھونٹی ہوئی چیزوں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے اپنے بچائے رہوگے تو خوب کروگے سلامت رہو۔ تب وے رخصت ہو کر انطاکیہ میں آئے اور جماعت کو اکٹھا کرکے وہ خط انہوں نے دیا اور جماعت کے لوگ اُس خط کو پڑھ کر اس تسلی کی بات سے خوش ہوئے "

یہ پہلا پولوسی گولہ تھا جو عیسائیوں کی پابندی شریعت پر پڑا ۔ آگے چلکر یہودی اور غیر یہودی عیسائیوں کا امتیاز بھی اُٹھ گیا اور اس رخصت نے اباحت کی صورت اختیار کرلی پھر اباحت نے استحباب کی صورت اختیار کی اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ شریعت کی پابندی بدعت اور بعض صورتوں میں کفر قرار دیگئی، شریعت موسوی سے نفرت اور بیزاری کا اظہار ہونے لگا اور اس اظہار نفرت میں توڑ شریعت ہم معنی الفاظ سمجھے جانے لگے ۔ یہی پولوس ہیں جو رومیوں کے خط باب ۴ آیہ ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ

" شریعت قہر کا سبب ہے "

اور قرنتیوں کے دوسرے خط کے باب ۳ آیہ ۱۳ و ۱۴ میں لکھتے ہیں کہ :-

" ہم موسی کی طرح عمل نہیں کرتے جس نے اپنے چہرہ پر پردہ ڈالا تاکہ بنی اسرائیل اس اٹھ جانے والی کی غایت تک بخوبی نہ دیکھیں "

اور عبرانیوں کے خط باب ۷ آیہ ۱۸ و ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ :-

" اگلا قانون (یعنی توریت کے دس حکم) اس لئے کہ کمزور اور بیفائدہ تھا اُٹھ گیا

کیونکہ شریعت نے کچھ کامل نہ کیا"۔

اور گلتیوں کے خط باب ۵ آیہ ۴ میں لکھتے ہیں کہ :-

"تم جو شریعت کی رو سے راستباز بننا چاہتے ہو تو مسیح سے جدا ہوئے اور فضل کی نظر سے گر گئے"۔

اور قلسیون کے خط باب ۲ آیہ ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ :-

"اُس نے (یعنی مسیح نے) تمہارے سب گناہ بخشدیے، اور حکموں کی دستاویز جو ہمارے مخالف تھی (یعنی توریت کے احکام خداوندی جو پولوس کے مخالف تھے ہماری بابت شادی (یعنی پولوسیوں کے لئے وہ احکام منسوخ کر دیے) اور اس کو بیچ میں سے اُٹھا کے صلیب پر کیلیں جڑ دیں (یعنی ان احکام کو نہ صرف نیست و نابود کر دیا بلکہ ذلت کی سزا دیکر نیست و نابود کیا کہ عیسائیوں کے سامنے اب اُن کا نام لینا بھی گناہ ہو گیا) اور حکومتوں اور ریاستوں کا اقتدار چھین لیا اور اُنھیں برملا رُسوا کرکے اُن پر شادیانے بجائے"۔

یہاں "حکومتوں اور ریاستوں کا اقتدار چھین لیا" سے یہ مراد ہے کہ شریعت سکھلانے والے فقیہوں اور فریسیوں کو جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا وہ بوجہ تعطیل شریعت اُن سے جاتا رہا اور اُن کی اِس رسوائی اور بیقدری پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔

بلندی سے پستی کی جانب اترنا آسان ہے مگر پستی سے بلندی پر آنا ذرا مشکل ہے۔ انسان بالطبع آزادی پسند اور آسانی پسند واقع ہوا ہے۔ جب پولوس نے شریعت کی بندشوں کو نہایت بے باکی کے ساتھ اسقدر ردّ و حیلا کر دیا تو ان کے متبعین نے ان کے بعد کیا کچھ گل نہ تراشے ہوں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے مشہور مجدد و مصلح و ریفارمر اور فرقہ پراٹسٹنٹ کے بانی مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء تا سنہ ۱۵۴۶ء) عیسائیوں کو کلیسا

اور پادریوں کی غلامی سے آزادی دلانے کے جوش میں اُنھیں اصلی مذہب کی پابندی سے بھی آزاد کئے دیتے ہیں۔ لوتھر صاحب کی تصانیف میں اس نوع کے فقرے بکثرت پائے جاتے ہیں کہ:۔ "ہم نہیں سُنیں گے اور نہ دیکھیں گے موسیٰ کو اس لئے کہ وہ صرف یہودیوں کے لئے تھا اور اس کو ہم سے کسی چیز میں علاقہ نہیں" "ہم نہ قبول کریں گے موسیٰ کو اور نہ اُس کی توریت کو اس لئے کہ وہ تو دشمن عیسیٰ ہے" "موسیٰ تو جلادوں کا استاد ہے" "دس حکموں کو عیسائیوں سے کچھ علاقہ نہیں" "اور ان دس حکموں کو خارج کرنا چاہئے تاکہ تمام بدعت ابھی موقوف ہو جائے کیوں کہ یہ احکام تمام بدعات کے سرچشمے ہیں" "خدا گناہ کا موجد ہے" (نعوذ باللہ) "انسان گناہ سے بچنے پر مختار نہیں" "دس حکموں پر عمل کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے" "فقط ایمان رکھو اور یقین کرلو کہ روزے اور پرہیزگاری اور اعمال نیک کی مشقت کے بغیر تم بخشے جاؤ گے اور تمہاری نجات اتنی یقینی ہے جتنی کہ خود مسیح کی۔ ہاں گناہ کرو اور خوب دلیری سے گناہ کرو۔ فقط ایمان رکھو اگرچہ ایک دن میں تم ہزار مرتبہ حرامکاری یا خون کے مرتکب ہو۔ صرف ایمان رکھو اور میں کہتا ہوں کہ تمہارا ایمان تمکو بچا لیگا"۔

لوتھر کے شاگرد رشید یوسی بیوس جو کہ فرقہ انٹی نومنس کے بانی ہیں لکھتے ہیں کہ:۔ "یہ دس حکم کلیسہ میں نہ سکھلائے جائیں" "جو لوگ دس احکام کی تعمیل میں مصروف رہتے ہیں وہ شیطان سے علاقہ رکھتے ہیں وہ سولی پائیں موسیٰ کے ساتھ" یہ دس احکام عہد عتیق کی کتاب خروج باب ۲۰ میں بتفصیل درج ہیں اور مختصراً یہ ہیں۔

۱۔ شرک نہ کرو۔

۲۔ بت پرستی نہ کرو۔

۳۔ خدا کا نام بے فائدہ مت لو۔

۴۔ یوم السبت کو پاک رکھو اور اس دن کوئی کام نہ کرو۔

۵۔ ماں باپ کی عزت کرو۔

۶۔ خون مت کرو۔

۷۔ زنا مت کرو۔

۸۔ چوری مت کرو۔

۹۔ پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دو۔

۱۰۔ ہمسایہ کو تکلیف نہ دو۔

ان احکام عشرہ کے عدم تعمیل کے معنے یہ ہوے کہ شرک کرو، بت پرستی کرو، خدا کا نام بے فائدہ لو، یوم السبت کی بے احترامی کرو، ماں باپ کی عزت نہ کرو، خون کرو، زنا کرو، چوری کرو، پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہیاں دو، ہمسایوں کو تکلیف پہنچاؤ۔ اس دستور العمل کا نام مذہب رکھا گیا ہے۔ اور اس پولوسی مذہب کے بانیوں نے اس دستور العمل کی صرف زبانی تعلیم ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور ان لوگوں کے سوانح کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ لوتھر اور پولوسی بیوتن وغیرہ نے اس کے مطابق عمل کرکے بھی دکھلا دیا۔ اس زمانے کے جو عیسائی ان تعلیمات پر عمل کرتے ہیں ان کو مسلمان علمائے محققین عیسائی نہیں کہتے بلکہ پولوسی کہتے ہیں اور اہل کتاب کے زمرہ سے خارج کرتے ہیں۔ جو احکام کہ اسلام میں اہل کتاب کے متعلق اور مسلمانوں کے اہل کتاب سے برتاؤ کے متعلق آئے ہیں ان سے پولوسی گروہ کو متمتع ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ بہرحال ہمکو اس سلسلہ مضامین میں پولوسی ... عقائد و اعمال سے سروکار نہیں ہم کو تو کتب سماوی کے سلسلہ میں تعلیمات انجیل پر تبصرہ کی ضرورت ... ان تعلیمات کو موجودہ عیسائی بحیثیت قبول کریں یا نہ کریں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے ... کو یہ حکم دیا تھا کہ علمائے یہود کی ذاتی خرابیوں سے بچو اور ان خرابیوں میں ان کی تقلید نہ کرو مگر ... تربیت ... تعلیم ...

عمل کرو کیونکہ احکام توریت عیسائیوں کے لئے واجب العمل ہیں۔ گویا شریعت موسوی اور شریعت عیسوی ایک ہی چیز ہے۔ اب ہم اس اعتبار سے شریعت عیسوی کی چند خصوصیات یہاں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو آج کل کے "عیسائیوں" یا پولوسیوں کی عام روش دیکھ کر اصلی عیسوی تعلیم کے متعلق غلط فہمیاں واقع نہ ہوں۔

طہارت احبار باب ۱۵ اور استثنا باب ۲۳۔ اور دوم سموئیل باب ۱۱ اور عہد جدید کے دوم قرنتیوں کے باب ۷ میں طہارت پر بڑا زور دیا گیا ہے مگر ان کی تعمیل پر آجکل بالعموم اس قدر زور نہیں دیا جاتا۔

ختنہ پیدائش باب ۱۷ آیہ ۹ سے ۱۵ تک ختنہ کا حکم ہے اور اس حکم پر زور دیا گیا ہے اور اسے خدا کا عہد قرار دیا گیا ہے۔ یہ حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے:-

"اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے (یعنی ابراہام کے) درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جاوے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ تمہارے پشت در پشت ہر لڑکے کا جب وہ آٹھ روز کا ہو ختنہ کیا جائے گا۔ کیا گھر کا پیدا کیا پردیسی سے خریدا ہوا جو تیری نسل کا نہیں لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زر خرید کا ختنہ کیا جاوے اور میرا یہ عہد تمہارے جسموں میں عہد ابدی ہوگا۔ اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اس نے میرا عہد توڑا۔"

تعجب ہے کہ ایسے صریح ایسے شدید ایسے اہم حکم کو عیسائیوں نے پس پشت ڈال دیا حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام کا ختنہ ہوا تھا۔ (دیکھو لوقا باب ۲ آیہ ۲۱) اور یوحنا بپتسمہ دینے والے کا بھی ختنہ ہوا تھا: دیکھو لوقا باب ۱ آیہ ۵۹۔ پولوس نے بھی عروج مسیح کے بیس سال بعد یعنی تخمیناً ۵۲ء یا ۵۳ء میں طماؤس کا ختنہ کیا

(۱) دیکھو اعمال باب ۱۶ آیہ (۱) (۳)۔

آج کل کے عیسائی اصطباغ کو ختنہ کا قایم مقام قرار دیتے ہیں مگر یہ خیال کئی وجوہ سے غلط ہے:

۱- انجیل میں کہیں کوئی حکم ایسا نہیں پایا جاتا جس کی رو سے اصطباغ کو قائم مقام ختنہ قرار دیا جائے۔

۲- اگر اصطباغ صحیح طور پر قائم مقام ختنہ ہے تو مختونوں کو اصطباغ کیوں دیا جاتا ہے؟ یعنی کوئی یہودی یا مسلمان عیسائی ہو تو اُسے اصطباغ دینے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

۳- اصطباغ یہودیوں میں بھی ختنہ کے ساتھ ہمیشہ سے جاری تھا۔ ایسی صورت میں ایک چیز دوسری چیز کی قائم مقام صرف اپنی رائے سے کیسے ہو سکتی ہے؟

رومن تاریخ کلیسا حصہ ۲ صفحہ ۲۲ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یروشلم کے کلیسہ میں عیسائیوں میں سنہ ۱ء کے قریب تک ختنہ کا دستور جاری رہا۔ جب یہودیوں کی مخالفت کے سلسلہ میں قیصر اورین نے حکم جاری کیا کہ ہر ختنہ کرنے والا قتل کیا جائے اُس وقت فلسطین کے عیسائیوں نے اس خوف سے کہ ان پر یہودی ہونے کا شبہ نہ کیا جائے نہ صرف ختنہ کو بلکہ ان تمام رسوم کو جنہیں وہ اور یہودی مشترک تھے یہ وقت ترک کر دیا اور ایک غیر یہودی مرکس کو اپنا بشپ قرار دیکر الگ ہو گئے اور جان کے خوف سے اپنی روش کو بدل ڈالا۔ مگر بعض عیسائیوں نے باوجود ان خطرات کے اپنی روش کو نہ بدلا اور اپنی قدیم چال پر قائم رہ کر اپنی جماعتوں کو علیحدہ کر لیا۔ انہیں لوگوں کو ابیونی کہتے ہیں۔

لحم الخنزیر سور کا گوشت نہ صرف کھانا بلکہ اسے ہاتھ تک لگانا حرام ہے۔ دیکھو احبار باب ۱۱ آیہ ۷ اور استثنا باب ۱۴ آیہ ۸ اور یسعیاہ باب ۶۵ آیہ ۳ و ۴ اور باب ۶۶ آیہ ۱۷۔ عہد جدید کی کتاب اعمال کے باب ۱۵ کی آیہ ۲۹ میں ہے کہ:۔

"تم بتوں کے چڑھاووں اور گلا گھونٹی ہوئی چیزوں اور حرامکاری سے پرہیز کرو۔" اس آیہ میں تحریف ہے بجائے "لحم الخنزیر" کے "حرامکاری" کا لفظ داخل کر دیا گیا ہے۔ یہاں صرف کھانے میں

چیزوں کی حلت و حرمت کا ذکر ہے۔ حرامکاری دوسرے مقامات پر حرام قرار دی گئی ہے۔ یہاں اس کا ذکر بے جوڑ ہے۔ قدیم یونانی نسخوں میں اس جگہ کو ترپاس کا لفظ پایا جاتا ہے جس کے معنی لحم الخنزیر کے ہیں۔ جدید نسخوں میں اس لفظ کو پورنیاس سے بدل دیا گیا جس کے معنی زنا کے ہیں۔ ڈاکٹر بنٹلی اور مسٹر ریوس جو اناجیل کے بڑے مصحح ہیں لفظ کو ترپاس ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

مئے نوشی احبار باب ۱۰ آیہ ۹ و ۱۰ کی رو سے شراب قطعاً حرام ہے اور نہایت شدت کیساتھ ہمیشہ کے لئے حرام کر دی گئی ہے۔ عہد جدید کی کتاب اول قرنتیون کے باب ۶ کی آیات ۹ اور ۱۰ کی رو سے شرابی "خدا کی بادشاہت کا وارث" نہیں ہو سکتا یعنی اس کا جہنمی ہونا قطعی ہے۔ متی باب ۲۴ آیہ ۴۹ و ۵۰ سے تو یہ بھی پایا جاتا ہے کہ شرابیوں اور متوالوں کے ساتھ کھانا بھی مسیح کی نگاہ میں گناہ تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ انجیل یوحنا (باب ۲) میں جو مسیح کا سب سے پہلا معجزہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شرابیوں کی مجلس میں جا کر مشکوں میں بھرے ہوئے پانی کو شراب بنا دیا۔ پولوس نے تمطاوس کو حکم دیا کہ شراب پیا کرو۔ (اول تمطاوس باب ۵ آیہ ۲۲) مرتے وقت عیسائی سیکرمنٹ میں نان پاؤ اور شراب کا استعمال کرتے ہیں، اور اسے مسیح کی آخری وصیت اور یادگار سمجھتے ہیں اور اسے عشار ربانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں پولوس نے طیطس کے نام اپنے خط میں (باب ۱ آیہ ۱۵) صاف لکھ دیا ہے کہ :-

"پاک لوگوں کے لئے سب کچھ پاک ہے پر ناپاکوں اور بے ایمانوں کے لئے کچھ پاک نہیں"۔ آئے الہام کی رو سے تو برگزیدہ لوگوں کے لئے سب ہی کچھ جائز ہو گیا۔ ان متضاد تعلیمات کو دیکھکر بھی تحریف اناجیل میں شبہ کرنا انتہا سے سادہ لوحی کی بات ہے۔

سود مندرجہ ذیل آیات میں سود لینے کی بہت سخت مذمت آئی ہے :- خروج باب ۲۲ آیہ ۲۵ احبار باب ۲۵ آیہ ۳۶ و ۳۷۔ استثنا باب ۲۳ آیہ ۱۹۔ زبور ۱۵ آیہ ۵۔ امثال ۲۸ آیہ ۸۔ حزقی ایل باب ۱۸ آیہ ۸ یرمیاہ باب ۱۵ آیہ ۱۰۔ علاوہ ازاین اول پطرس باب ۵ آیہ ۲ اور

اور تعداد ۲۰ باب ۲ آیہ میں جو "قمار و النفع" کی ممانعت ہے اس میں سود کو شامل سمجھا جا سکتا ہے۔

یوم السبت یہودیوں کے نزدیک یوم السبت یعنی سنیچر کا دن مبارک سمجھا جاتا تھا اور اس دن سارے کام کاج چھوڑ کر عبادت کی جاتی تھی (خروج باب ۲۰ آیہ ۸ و ۹) عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بھی سنیچر ہی کے دن کی بزرگی کو مانتے تھے (متی باب ۲۴ آیہ ۲۰) اب بجائے سنیچر کے عیسائیوں نے محض اپنی ذمہ داری پر اتوار کا دن متبرک قرار دے لیا ہے جس کی کوئی سند نہ توریت میں کہیں پائی جاتی ہے نہ انجیل میں اور یوں دیکھا جائے تو جمعہ کے دن عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بیان کی جاتی ہے اور جمعہ ہی کے دن قصہ صلیب پیش آیا۔ اور نجات امت واقع ہوئی۔ اس اعتبار سے تو جمعہ کے دن کو سنیچر اور اتوار دونوں پر فضیلت ہوئی۔

احترام انبیاے سابقین تحریف و الحاق کا برا ہو اس معاملہ میں بھی اناجیل مروجہ کی بعض عبارات اور عیسائی مفسرین کی ان پر طبع آزمائیاں اطمینان بخش نہیں بلکہ مذاق سلیم کو یہ باتیں بہت کھٹکتی ہیں۔ یوحنا باب ۱۰ آیہ ۸ میں ہے کہ: "سب جتنے مجھ سے (یعنی مسیح سے) آگے آئے چور اور بٹمار ہیں پر بھیڑوں نے ان کی نہ سنی" تھامس اسکاٹ صاحب اس آیہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: "وہ جو عیسیٰ سے پہلے آئے ہیں ان کو وفادار ہادی اور نبی نہ سمجھنا چاہئے کیونکہ انہوں نے اسی کے ماتحت حکومت کا کام کیا اور اس کے پیش رو رہے"۔ لارڈنر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بشپ مانی کا قول ہے کہ جناب مسیح کا یہ کہنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں تھا۔ ناکس بھی اس قول کو موسیٰ علیہ السلام ہی کے حق میں قرار دیتا ہے گو تفسیر بھی اس معاملہ میں انہیں لوگوں کا پیرو ہے مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ ایسی صورت میں عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی کو برقرار کیوں رکھا اور اپنی امت کو اس کی پیروی کا تاکیدی حکم کیوں فرمایا ان دو متضاد قولوں میں سے ایک کو الحاقی ضرور ماننا پڑے گا قرائن تو اسی کی شہادت دیتے ہیں کہ انبیائے اولوالعزم کی شان میں اس نوع کے گستاخانہ کلمات پابندی شریعت سے ان لوگوں کی طبعی بیزاری کی دلیل ہیں۔ جناب مسیح بھی اپنے متبعین کے ان گستاخانہ تیوروں سے نہیں بچے چنانچہ پولوس کلیسیوں کے

نام اپنے خط (باب ۱ آیہ ۲۴) میں لکھتے ہیں کہ:۔ "اب میں اپنی ان مصیبتوں سے جو تمہارے واسطے کھینچتا ہوں خوش ہوں اور مسیح کی مصیبتوں کی کمیاں اس کے بدن کے (یعنی کلیسہ کے) لئے اپنے جسم سے پورے دیتا ہوں۔" یہاں پولوس صاف طور پر عیسیٰ علیہ السلام کی مصیبتوں کو ناقص اور اپنی مصیبتوں کو کامل قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ اپنے خاص نبی اور رسول سے نہیں چوکتے وہ بھلا دوسروں سے کب باز آسکتے ہیں۔ یہی پولوس دوم قرنتیون کے باب ۱۱ آیہ ۵ میں لکھتے ہیں کہ:۔ "میں اپنے میں سب سے بڑے رسولوں سے کچھ کم نہیں سمجھتا ہوں۔" اسی باب کی آیہ ۲ میں یہ اپنے آپ کو ایک بات میں خدا تک سے تشبیہ دے جاتے ہیں لکھتے ہیں کہ:۔ "مجھے تمہاری بابت خدا کی سی غیرت آتی ہے"۔ ہم ان فقروں پر اس مضمون میں توجہ نہ کرتے اور صحف سماوی پر تبصرہ کرنے والے کو ضرورت بھی نہیں کہ زید عمرو بکر کی تحریروں پر التفات کرے۔ مگر جب ان تحریروں کو الہامی قرار دیا گیا ہو اور صحف سماوی کے تحت میں لا کر مجموعہ کتب عہد جدید میں انہیں شامل کر دیا گیا ہو تو ان کے مضحکہ انگیز پہلوؤں کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

(باقی)

تنزیل و تاویل
بسم اللہ الرحمن الرحیم

از

جناب مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔

حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم کی ہدایت کے لئے ایک سو چار کتابیں مختلف انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام پر اتاریں اور تمام علوم اور حکمتوں کو ان میں ودیعت رکھا اور پھر ان سب کا خلاصہ توریت و انجیل و زبور و قرآن حکیم میں درج فرمایا۔ اور پھر ان سب علوم کو قرآن کریم میں بھر دیا اور پھر قرآن کے تمام علوم کو مفصل میں اور علوم مفصل کو فاتحۃ الکتاب میں ودیعت فرمایا۔ اور فاتحۃ الکتاب کے علوم کو اپنی حکمت بالغہ سے بسم اللہ الرحمن الرحیم میں بھر دیا۔

کہتی ہے یہ زبان سے قرآں کی خامشی
لاریب ذات پاک کی سچی کتاب ہوں

مجھ میں بھرے جہاں کے علوم و فنون ہیں
قرآن میرا نام ہے ام الکتاب ہوں

بعض علمائے سلف کے نزدیک بسم اللہ الخ سورۂ فاتحہ اور ہر سورۃ کا جزء ہے اور امام اعظم ابو حنیفۃ النعمان۔ اور امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک سوائے سورۂ نمل کے کسی سورۃ کا جزء نہیں۔ دو سورتوں میں فصل کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہے تبرکاً ہر سورت کی ابتدا میں اس کو لکھا جاتا ہے۔ سنن ابی داؤد میں باسناد صحیح ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اِنَّ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو سورتوں میں فصل
کان لا یعرف فصل السورۃ حتی تنزل نہ جانتے تھے۔ یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نازل ہوئی۔

اور اسی وجہ سے بسم اللہ الخ کو نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ جہراً نہیں پڑھا جاتا تاکہ جزءِ فاتحہ ہونیکا واہمہ نہ ہو۔ اور اسی لئے بسم اللہ الخ کو کسی سورت کیساتھ ملاکر نہیں لکھتے بلکہ ہمیشہ سورۃ سے علیحدہ لکھتے ہیں بسم اللہ الخ چونکہ بالاتفاق سورۂ نمل کا جزء ہے اس لئے اس کو مثل دیگر آیات کے ملاکر لکھا جاتا ہے۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور خلفاء راشدین کی مستمر سنت یہ تھی کہ بسم اللہ کو نماز میں آہستہ پڑھتے تھے۔ (ابن کثیر۔ ترمذی۔ زاد المعاد)

امام ابو بکر رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کی خوب تفصیل فرمائی ہے اور امام اعظم نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک کا خوب مدلل اور مبرہن ہونا ثابت کیا ہے۔ حضرات اہل علم اس کی مراجعت فرمائیں۔

بسم اللہ کے شروع میں جو باء ہے بعض علماء کے نزدیک وہ مصاحبت اور الصاق کے لئے ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک استعانت کے لئے، اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس صورت میں ابتداہی سے اپنی عبودیت اور عجز و استکانت کا اظہار اور پہلے ہی وہلہ میں اپنی حول اور قوۃ سے تبریہ کا اعلان ہوجاتا ہے۔ یعنی اسی کی اعانت اور توفیق سے ہم شروع کرتے ہیں، حاشا اپنی حول اور قوۃ سے نہیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ اور بارگاہ الوہیت کا ادب بھی اسی کا مقتضی ہے کہ وہاں عبودیت اور تذلل ہی کا اظہار ہو۔ ادعاء مصاحبت نہو۔ تعالیٰ جد ربنا ما اتخذ صاحبۃ

اور یہی معنی ایاک نستعین کے زیادہ مناسب ہیں۔ اور یہی معنی لاحول ولاقوۃ الا باللہ کے مرادف ہونیکی وجہ سے کَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ (یعنی جنۃ کے خزانوں میں سے ایک خزانہ) کہلانے کے مستحق ہوسکتے ہیں اور باء بسم اللہ کا کسرہ بھی انکسار اور ذلِ عبودیت ہی کی طرف مشیر ہے۔

اللہ اس ذات واجب الوجود کا علم ہے جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے اور ہر قسم کے

عیب اور نقص کے شائبہ اور واہمہ سے بھی پاک اور منزہ ہے اور اسی وجہ سے لفظ جلالہ ہمیشہ موصوف ہی واقع ہوتا ہے اور اسمائے حسنیٰ کو بطور صفت اس اسم عظیم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ ہُوَ اللّٰہُ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ۔ ہُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ہُوَ اللّٰہُ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُہَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ہُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔

اور یہ اسم عظیم۔ رب اعلیٰ ہی کیساتھ مخصوص ہے اس کا اطلاق ہمیشہ سے صرف اُسی وحدہٗ لا شریک لہٗ کی ذات پاک کے لئے ہوا ہے۔ جس طرح کوئی اس کی ذات وصفات کا شریک سہیم نہیں اسی طرح اس اسم عظیم میں بھی اس کا کوئی قسیم نہیں۔

غالباً اسی وجہ سے امام اعظم رضی اللہ عنہ نے لفظ جلالہ کو اسم اعظم فرمایا ہے جیسا کہ امام طحاوی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے۔

حدثنا محمد بن الحسن عن ابی حنیفۃ	محمد بن حسن نے روایت کیا امام ابو حنیفہ سے کہ اسم
قال اسم اللّٰہ الاکبر ھو اللّٰہ قال	اعظم لفظ اللہ ہے۔ کہا محمد بن حسن نے اس لئے
محمد الاتری ان الرحمن اشتق	کہ رحمن مشتق ہے رحمت سے اور رب ربوبیت سے
من الرحمۃ والرب من الربوبیۃ	اور اسی قسم کی مثالیں ذکر فرمائیں۔ اور لفظ اللہ
وذکر اشیاء نحو ھذا واللّٰہ غیر	کسی شئے سے مشتق نہیں۔
مشتق من شئ اھ مشکل الآثار ص ۶۳ ج ۱	

خود چہ شیریں است نام پاک تو   خوشتر از آب حیات ادراک تو

نام تو چوں بر زبانم میرود   ہر بن مو از عسل جوئے شود

اللہ اللہ این چہ شیرین است نام		شیر و شکر می شود جانم تمام

اللہ اللہ این چہ نام خوش مذاق		حرف حرفش مید ہد جان را بوقِ خوبی و متی"

اسم اعظم ہست اللہ عظیم		جان جان و ہمی عظیم ریم

(خاتمہ مثنوی از مفتی الہی بخش کاندھلوی قدس اللہ سرہ)

اسم اللہ کے بعد تمام اسماء حسنیٰ میں اسم رحمن کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے کما قال اللہ تعالیٰ۔

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمن		آپ کہدیجے کہ اللہ کو پکارو یا رحمن کو۔

نیز ہراسی وجہ سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب یہ دو نام ہیں۔ عبد اللہ اور عبد الرحمن۔ عبد اللہ میں عبد، اسم اعظم کی طرف مضاف ہے اور عبد الرحمن میں اسم رحمن کی طرف مضاف ہے جس کا مرتبہ اسم اعظم کے بعد ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ کو پہلے ذکر فرمایا اور عبد الرحمن کو بعد میں۔

رحمن اور رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں۔ اور ان دونوں صفتوں کا اطلاق حق جل و علا پر ایسا ہی حقیقی ہے جیسا کہ علیم و قدیر اور سمیع و بصیر کا اطلاق اس پر حقیقی ہے۔ اور جس طرح اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں اور اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے سننے اور دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کی رحمت بھی ہماری رحمت کے مماثل نہیں۔

لیس کمثلہٖ شیئ وھو السمیع البصیر		کوئی شی اس کے مثل نہیں وہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے

وہ اپنے سننے اور دیکھنے میں اور ادراک اور علم میں جوارح کا محتاج نہیں۔

واللہ الغنی وانتم الفقراء		اللہ ہی ہر طرح سے بے نیاز ہے اور تم اس کے محتاج ہو۔

اسی طرح وہ اپنی صفات رحمت میں بھی نہ رقتِ قلب کا محتاج ہے اور نہ انفعال نفس کا جیسے اس کی ذات بے چون وبیگون ہے اسی طرح اس کی صفت علم و قدرت اور صفت رافت و رحمت

وغیرہ بھی بے چون وچگون ہے۔

اس کی بے چون وچگون رحمت حقیقیہ علماء کی مجاز وتاویل اور استعارہ وتمثیل کی ذرہ برابر محتاج نہیں۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من خاک بر فرق من وتمثیل من

صفات باری تعالیٰ میں صحابہ وتابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا یہی مسلک تھا۔ اور وہ حضرات اس قسم کے مسئلہ شئی کے اسماء حسنیٰ میں تاویل کو بدعت سمجھتے تھے۔

امام ابوالحسن اشعری نے اخیر عمر میں متکلمین کے طریق تاویل وتمثیل کو چھوڑ کر مذہب سلف ہی کی طرف رجوع فرمایا جیساکہ امام موصوف نے اپنی آخری تصنیف کتاب الابانہ میں اس کی تصریح کی ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کی تفصیل الرحمن علی العرش استوی کی تفسیر کے وقت ہدیہ ناظرین کریں گے۔ واللہ الموفق وھو المستعان۔

ابتدا کے لئے ان تین ناموں یعنی اللہ اور رحمن۔ اور رحیم کو اس لئے خاص فرمایا کہ انسان پہ تین حالتیں گذرتی ہیں۔ اول اس کا عدم سے نکلکر وجود میں آنا۔

دوم اس کا باقی رہنا اور جس قدر خلاق علیم نے اس کے لئے مدت بقا مقدر فرمائی ہے اس کو پورا کرنا جس کو عرف میں حیات دنیا اور زندگی کہتے ہیں۔

سوم اس نشأۃ دنیا کے ختم ہونے کے بعد حیات دنیویہ پر ثمرات کا مرتب ہونا عمل نیک پہ جزا اور عمل بد پر سزا پانا۔

پس ابتداء میں تین نام ذکر فرمائے تاکہ تینوں حالتوں کی جانب اشارہ ہوجائے لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب اشارہ ہے اس لئے کہ تخلیق وتکوین بارگاہ الوہیت سے متعلق ہے۔ اور لفظ رحمن سے دوسری حالت کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے جو اس

ٹھیک راستہ پر چلا اس کے لئے آخرت کی تمام منزلیں آسان ہیں۔ شیطان اور نفس امارہ ہر وقت اس کی تاک میں ہے اس لئے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہا رحمت کا محتاج ہے۔

اور لفظ رحیم کو تیسری حالت یعنی نشاۃ آخرت کے یاد دلانے کے لئے ذکر فرمایا۔

دار دنیا چونکہ مومن و کافر سب کیلئے باعث رحمت ہے مومن کیلئے تو ظاہر ہے کافر کے حق میں دنیا اس لئے رحمت ہے کہ وہ اپنے کفر سے توبہ کر سکتا ہے اور اگر سو اختیار سے توبہ بھی نہ کرے تو فی الحال اس کا عذاب جہنم سے رہا رہنا ہی بہت بڑی رحمت ہے۔ نیز بعثت انبیاء اور ارسال رسل اور انزال کتب ایک ایسی عظیم رحمت ہے کہ جو مومن اور کافر سب کے لئے ہے یہ امر آخر ہے کہ کوئی اس رحمت سے متمتع اور منتفع ہوا اور کوئی نہ ہوا۔ الحاصل دار دنیا مومن اور کافر سب کے لئے باعث رحمت ہے اور دار آخرت صرف مومن کے لئے باعث رحمت ہے اور کافروں کے لئے باعث عذاب و نقمت۔ کما قال تعالےٰ۔

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ فَذٰلِكَ یَوْمَئِذٍ پھر جب صور پھونکا جائیگا تو وہ دن بڑا سخت ہوگا کافروں
یَوْمٌ عَسِیْرٌ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ پر آسان نہ ہوگا۔

اس لئے نشأۃ دنیا کے یاد دلانے کے لئے لفظ رحمٰن۔ کہ جس میں بہ نسبت رحیم کے زاید مبالغہ ہے ذکر فرمایا۔ اور نشأۃ آخرت کے یاد دلانے کے لئے رحیم کا لفظ استعمال فرمایا اس لئے کہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہونے کی وجہ سے عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے۔ اور عموم رحمت کا محل صرف دار دنیا ہے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا۔ اور دار آخرت خاص مومنوں کی رحمت کے لئے ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔ اور وہ ایمانداروں پر رحمت والا ہے۔

نیز رحمٰن۔ فعلان کا وزن ہونے کی وجہ سے کچھ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے

لہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں استوار علی العرش کو ہمیشہ صفۃ رحمٰن ہی کیساتھ ذکر فرمایا ہے۔ الرحمٰن علی العرش استوی ثم استوی علی العرش الرحمن۔ اس لئے کہ عرش تمام مخلوقات کو محیط ہے جیسا کہ اس کی رحمت مخلوق کو محیط اور واسع ہے کما قال تعالیٰ ورحمتی وسعت کل شیئ پس الرحمن علی العرش استوی سے سب سے زیادہ وسیع مخلوق پر سب سے زیادہ وسیع صفت رحمت کے ساتھ استوی بیان کرنا مقصود ہے اور صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قضاء خلق کے بعد ایک کتاب میں لکھکر کہ رحمتی تغلب غضبی یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے اپنے قریب عرش پر رکھا۔

اس لئے کہ کلام عرب میں۔ وزن فعلان۔ اکثر صفات عارضہ اور اوصاف متجددہ اور حادثہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے جیسے عطشان وریان وعصبان وغیرہ۔ لہذا لفظ رحمن سے اس دار حدوث وتجدد اور دار فانی کیطرف اشارہ مناسب ہوا۔

رحیم صفۃ مشبہ کا صیغہ ہے۔ جو دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے فَعِیْلٌ کا وزن کلام عرب میں معانی ثابتہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ علیم وحکیم حلیم وجمیل۔ لہذا لفظ رحیم سے دار باقی اور عالم جاودانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔

علامہ آلوسی کے کلام سے رحمن اور رحیم میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ رحمن سے عام رحمت مراد ہے خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ صورۃً اور معنیً ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہو یا فقط معنیً اور باطناً رحمت ہو اگرچہ صورت اور ظاہر کے لحاظ سے وہ عذاب ہو جیسے مریض کو تلخ دوا کا پلانا صورۃً ایلام اور تکلیف ہے مگر معنیً سراسر رحمت ہے پس رحمن سے ایسی ہی عام رحمت مراد ہے جو ان تمام انواع واقسام کو شامل ہو یہ دار فانی اسی قسم کی رحمت کا محل ہے کبھی اس کی رحمت راحت وانعام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، اور کبھی مصائب وآلام کی صورت میں کما قال تعالیٰ عَسٰٓی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

اور رحیم سے وہ رحمت مراد ہے جو بلا واسطہ ہو اور ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہی رحمت ہو۔ دار آخرت میں اسی قسم کی رحمت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ بھی ہوگی اور کسی قسم کا امیں شائبہ رنج والم کا بھی نہ ہوگا۔

خلاصہ

یہ کہ لفظ اللہ میں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ذات تمام صفات کمال کی جامع اور تمام نقائص وعیوب سے پاک اور منزہ ہے۔ تمام مباحث الٰہیات کیطرف اشارہ ہے۔

اور لفظ رحمن میں مباحث نبوت وشریعت کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے بغیر خدا کی

مرضی کے موافق ایک لمحہ گذرنا محال ہے۔

اور لفظ رحیم میں اجمالاً تمام امور آخرت کیطرف اشارہ ہے اور یہی وہ تین امر ہیں کہ جو تمام انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی تعلیم کا لباب اور عطر ہیں۔

مرآۃ المثنوی

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم

کا

بہترین اڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کیلئے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔

کاغذ کتابت طباعت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت عہ سکہ انگریزی لعہ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

حاملان قرآن

شیخ محمد افضل عمادی

از جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

ما شرح معجز دم عیسیٰ نوشتہ ایم — تفسیرے از خدای تعالیٰ نوشتہ ایم

در راہ نور بے سر و پا بود مہر و ماہ — انوار حسن یار سراپا نوشتہ ایم

یہود سے خطاب اور اسباب عتاب

یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ من و سلویٰ کھاتے کھاتے جی بھر گیا خدا سے دعا کیجیے کہ تبدیل ذائقہ کے لیے کچھ زمین کی پیداوار عنایت ہو۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یَا مُوسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا۔	وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تو ایک ہی کھانے پر کبھی قناعت نہ کریں گے۔ اس لیے ہمارے حق میں اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ ہمارے لئے زمین کی پیداوار نکالے مثلاً ساگ ترکاری، ککڑی، لہسن (یا گیہوں یا چنے) مسور اور پیاز
قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا	کہا کیا تم لوگ اچھی چیز کو ادنیٰ چیز سے بدلتے ہو؟ کسی شہر میں اتر پڑو کہ جو تم نے چاہا ہے وہاں سب ملجائیگا ذلت اور مسکنت نے ان کو گھیر لیا اور وہ اللہ کے غضب

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (۲:۶۱)

کے ساتھ لوٹے' یہ اس لئے ہوا کہ وہ لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور انبیا کو ناحق مار ڈالتے تھے۔ اس کفر بآیات اللہ وقتل نبیین کے مرتکب وہ اس بنا پر ہوئے تھے کہ انہوں نے نافرمانی کی' عاصی ہوئے' معصیت میں پڑے اور وہ حد سے بڑھ جایا کرتے تھے۔"

سوال یہ تھا کہ یہودی اتنے بڑے عذاب کے مستحق کیوں ٹھیرے۔

(۱) ایک ہی لون طعام کا لزوم و دوام اگر ذائقہ کو خوش نہ آئے اور تبدیل مزہ کی بہ نسبت درخواست کی جائے' زمین کی پیداوار کو جی چاہے' جس کے اہل زمین خوگر ہیں' تو اس میں معصیت کی کیا بات ہے؟

۲۔ یہود نے کسی غیر سے رجوع نہیں کیا تھا' اپنے پیغمبر سے درخواست کی تھی' نہ اس حیثیت سے کہ پیغمبر کوئی فاعل مختار ہیں' بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ "فرستادۂ خاص پروردگار" ہیں' پروردگار سے دعا کریں کہ ہماری مراد بر آئے' پیغمبر سے دعا کرانے اور خدا سے ایک مدعائے جائز کے طلبگار ہونے میں کیا کفر ہے۔؟

۳۔ درخواست گذاروں نے پیغمبر کو درخواست دی تھی' جواب بھی انہیں کی زبان سے ملنا چاہئے تھا۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے کہیں برتر ہے کہ بندے تو نبی سے خطاب کریں اور جواب اللہ دے۔

۴۔ ادنیٰ کے معنی اقرب ہیں' من الدنو' قربت میں کیا اشارہ ہے؟

۵۔ اس وقت تک یہود سے کفر بآیات اللہ وقتل نبیین بغیر الحق ثابت نہیں' جو ناکردنی افعال بعد کو ہوئے قبل ہی سے اس کا مواخذہ یعنی چہ؟ مواخذہ وقوع فعل کے بعد ہے' ہنوز فعل واقع نہیں ہوا کہ مواخذہ ہونے لگا' اس کے کیا معنی؟

فرمایا: حسن بن حسن البصری سے روایت ہے:۔

انھم کانوا اھل کراث وابصال و — یہ لوگ گندنا اور پیاز اور سور کھانے والے لوگ تھے

اعلاس فنزعوا الی عکرھم عکرالسوء واشتاقت طبایعھم الی ماجرت علیہ عادتھم فقالوا لن نصبر علیٰ طعام واحد ای نوع منہ۔

اسی خوی بد کی جانب مایل ہوئے، طبیعت میں اسی عادت جاریہ کا شوق بڑھا، اسی بنا پر کہنے لگے "ہم تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے" یعنے ایک طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے۔

یہ ایک طرح کا کھانا کیا تھا جس پر وہ صبر نہ کرسکے' اس کی حقیقت بھی سن لیجیے:۔

والمراد بالطعام الواحد ھو المن والسلویٰ وھما وان کانا طعامین لکن لما کانوا یاکلون احدھما بالاخر جعلوھما طعاما واحداً لتکررھما فی کل یوم وعدم وجود غیرھما معھما ولاتبدلہ بھما۔

طعام واحد سے مراد من وسلویٰ ہے' یہ دونوں اگرچہ دو مختلف طعام تھے لیکن بنی اسرائیل ان دونوں کو روزمرہ ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کے کھایا کرتے تھے' اس لیے ایک ہی کھانا قرار دیا بار بار یہی دونوں چیزیں ہر روز کھانے کو ملیں' ان کے ساتھ کوئی اور کھانا موجود نہ ہوتا اور نہ اس میں کبھی تبدیلی ہوتی۔

دوسری تفسیر یہ ہے:۔

انما طلبوا ھذہ الانواع لانھم ملوا من البقاء فی التیہ فسالوا ھذہ الاطعمۃ التی لا توجد الا فی البلاد وکان غرضھم الوصول الی البلاد لا تلک الاطعمۃ

بنی اسرائیل نے یہ چیزیں اس لئے طلب کیں کہ "تیہ" میں رہتے رہتے گھبرا گئے تھے' اس بنا پر ایسے مطعومات کی خواہش کی جو بجز شہروں کے اور کہیں نہیں ملتے غرض یہ تھی کہ کسی طرح شہری آبادی تک پہنچ سکیں، یہ کھانے مقصود بالذات نہ تھے۔

جواب میں اگرچہ بہتر کو چھوڑ کر فروتر کی خواہش پر ملامت کی گئی تاہم "تیہ" سے نکل کے کسی شہر میں اُتر پڑنے کی اجازت مل گئی اور یہی درخواست گذاروں کا مدعا تھا۔

"تیہ" میں بنی اسرائیل کے ابتلا و افتتان کا سبب یہ تھا (واللہ اعلم بحقیقتہ!) کہ مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرتے پشتیں گذر چکی تھیں، محکومیت کے تمام جراثیم چھا گئے تھے، اللہ چاہتا تھا کہ اس قوم کو غالب بنائے اور ایک دنیا کا حاکم و فاتح فرمائے جس کے لئے جفاکشی و خشونت عیش و شظف معیشت و مواظبت محنت لازم تھی، اس جنگی تربیت کے لئے تیہ جیسا ریگستان منتخب ہوا جو وسائل تنعم و ذرائع آرام پسندی سے یکلخت عاری تھا! یہ تربیت اگرچہ سخت تھی مگر کوئی محکوم قوم بدون سخت ترین جنگی تربیت کے حکومت پر فائز نہیں ہو سکتی، بنی اسرائیل کا اس سے گھبرانا اور اس تربیت کی سختیوں پر صبر کرنے سے بشدت انکار کرنا یہی معصیت تھا۔

۲۔ تنبیہ اس بات پر نہیں ہوئی تھی کہ پیغمبر کا کیوں ذریعہ اختیار کیا۔ بلکہ تنبیہ کا سبب یہ تھا کہ اس دشت مخوف میں خدا اُن کو ایسی تربیت دینا چاہتا تھا جو فیروزی اور فیروزمندی کی دلیل راہ ہو، اس منشاء رحمت سے جب بنی اسرائیل نے انکار کیا تو عتاب کے مستحق ہوئے۔

۳۔ مفسرین نے قاطبۃً یہی تفسیر کی ہے:۔

قال یعنی موسیٰ علیہ السلام لھم — یعنے کہنے والے اور بنی اسرائیل کو جواب دینے والے

وقیل القائل ھو اللہ والاول اولیٰ — موسیٰ علیہ السلام تھے، ایک ضعیف تاویل یہ بھی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا مگر پہلی ہی تفسیر زیادہ درست ہے،

لیکن اگر خطاب بالنبی کا جواب من اللہ بھی ہو تو اس سے خدا کی شان میں کوئی شین لازم نہیں آتا۔

۴۔ قربت میں یہ اشارہ ہے کہ قریب تر زمانہ میں یہی چیزیں اُن کو ملا کرتی تھیں اور ان سے طبیعت مالوف تھی، مفسرین لکھتے ہیں:۔

والمراد أتضعون ھذہ الاشیاء التی — مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ان چیزوں کو اختیار کرتے ھی دون موضع المن والسلوی اللذین — ہو جو من وسلوی کے درجہ سے گری ہوئی ہیں!

هما خیر منها۔ من وسلویٰ ان سب سے بہتر ہے۔

اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ "ادنیٰ" کے معنی اسفل وارذل کے بھی آتے ہیں۔

فان الادنیٰ اصلہ من دون ای الردیٔ لفظ ادنیٰ "دون" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ردی کے ہیں

۵۔ بے شبہ اس وقت تک یہود نہ کفر کے مرتکب ہوئے تھے نہ اپنے پیغمبروں کی ناحق خون ریزی کی تھی، اس میں بھی شک نہیں کہ کسی فعل پر مواخذہ وقوع فعل کے بعد ہونا چاہیئے، یہ بھی مسلم ہے کہ یہ سوال ایسا نہ تھا کہ ضرب ذلت ومسکنت وتبوء بغضب اللہ کا مستحق بناتا، لیکن یہاں سرے سے یہ بات ہی نہیں، سوء فہم سے یہ شبہات ناشی ہوئے، قلت تدبر نے ان پر رنگ چڑھایا اور فقدان تفقہ نے محل اعتراض بنایا، کہنے کی بات یہ نہیں کہ لوگوں نے آیت کی تاویل کیا کی ہے، کہنے کی بات یہ ہے کہ اللہ کیا کہتا ہے ایک زمانہ میں نظیری نے کہا تھا۔

ہر ذرہ را بقدر طلب نور دادہ اند در کار خویش شب پرہ را آفتاب گیر

اب آپ اس کو یوں پڑھئے۔

بگزار برق طور وشرار شہاب را دریاب نور وشب پرہ گیر آفتاب را

آیت۔ "وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ" اس میں اللہ تعالیٰ کو جو کچھ کہنا تھا سب کہ دیا، صیغۂ خطاب سے ابتدا کی ہے اور خطاب ہی پر انتہا ہوئی ہے، کہ اے بنی اسرائیل اس وقت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے یہ کہا تھا اور موسیٰ نے اس کا یہ جواب دیا تھا۔

یہاں تک یہ مضمون پورا ہو گیا، اب اس کے بعد دوسرے جملہ سے دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے

کہ بنی اسرائیل کی فلاں وفلاں بدکرداریوں نے اُن کو ذلت ومسکنت وغضب الٰہی کا مستحق بنایا، پھر ان بدکرداریوں کی علتیں بیان کی ہیں، پھر انھیں علل واسباب کے منشاء ورود کی توضیح کر دی ہے کہ آنے والی قومیں محفوظ رہ سکیں اور کوئی محل اشتباہ نہ رہ جائے۔

یہ پورا بیان صیغۂ غائب سے آغاز ہوتا ہے اور غائب ہی پر اس کا انجام ہے تمام تفسیریں شاہد ہیں کہ وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ ای ضرب علی غیرو علیھم واحلافھم الھوان والفقر والفاقۃ مطلب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی جو نسل بعد کو آنے والی تھی اور کفر آیات اللہ وقتل نبیین بغیر الحق کا ارتکاب کرنے والی تھی اُن پر ذلت ومسکنت محیط ہوگئی۔

"ذلک" سے یہود کے ذلیل ومغضوب ہونے کے سبب اول کی طرف پہلے اور سبب ثانی کی طرف بعد میں اشارہ کیا ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں :-

ومجموع ما بعد الاشارۃ الاولی والاشارۃ الثانیہ ھو السبب لضرب الذلۃ وما بعدہ۔

"ذلک" کے ذریعے آیت میں دو بار اشارے کئے ہیں انہیں اشارات کا مجموعہ یہودیوں کے ذلیل ہونے اور بعد کو مغضوب ہو کر رہنے کا باعث ہوا۔

یہ اطناب واسہاب ممکن ہے مُمل ہو لیکن تقصیر وتقلیل شاید حقائق حق میں مُخل ہوتی ولی فیھا مآرب اُخری۔

چنانچہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

آیت میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ صبر علی المکارہ سے جس کو انکار ہے اللہ کی رحمت اُس سے بیزار ہے اللہ کی رحمت اُسی کے لئے ہے جو شہیات ومستلذات نفس کے فقدان پر از خود رفتہ نہ ہو جائے جس کا خمیر ہی ہو اُسی میں لگا، ہے کہ لزوم صلاح واستمرار خیر مُثمر فتوح ومزکی روح ہے، ونعم اجر العالمین۔

بہر کاری کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد

صلاۃ علی آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آل رسول پر بھی درود بھیجنا لازم ہے اور اس میں لفظ "علی" سے تفریق نہ کرنی چاہئے۔

فرمایا، ہم اسی کے خوگر ہیں کہ رسول کے ساتھ آل رسول پر بھی درود بھیجیں۔ اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید، اللھم بارک علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید۔

لیکن لزوم و تفریق کی کوئی روایت صحیح ثابت نہیں "اللہ تعالی نے ہدایت فرمائی ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۳۳:۷)

حقیقت میں اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں اے وہ لوگو کہ ایمان لا چکے ہو پیغمبر پر درود و سلام بھیجو۔

یہاں فقط صلاۃ علی النبیؐ پر اقتصار ہے اور اس کے ساتھ کسی اور کی شرکت نہیں۔

لباس فاخر

لزوم و تفریق کے متعلق دریافت فرمایا کہ یہ معانی کہاں سے بیان کیے؟

عرض کی:۔ جناب قبلہ و کعبہ ...... تشریف لائے ہیں اور بڑی شان و شوکت سے دریبہ میں مقیم ہیں۔ لباس فاخر در بر عمامہ طیب الشمامہ بر سر کل کے موعظہ میں بھی تصریح کی تھی اور اس کے اطراف بحث پر جناب قبلہ و کعبہ نے شرح و بسط سے نظر ڈالی تھی، فرمایا:۔

بیا د طوف حریم برہنہ پا یاں کن — کہ با تو کعبہ سخن در لباس می گوید

عرب قدیم میں ایک شخص فاخر تھا جسے بہترکیلے کپڑے پہننے کی عادت تھی، عربوں کی سادگی

بھڑک اور نمود کی متحمل نہ تھی، اس لیے یہ وضع مذموم مضروب المثل ہوگئی کہ بیشتر محبیوں کو بھڑکیلے لباس میں دیکھتے تو کہتے "ھٰذا لباسُ فاخر" یہ فاخر کی وضع ہے یعنی ویسی ہی بھڑک اس میں بھی ہے۔

فخور

فاخر کے بعد "فخور" کی جانب ذہن منتقل ہوا کہ اللہ تعالیٰ "مختالِ فخور" کو کیوں دوست نہیں رکھتا؟

الفخور من الابل العظیمۃ الضرع العلیاتۃ اللبن، ومن الغنم کذلك — جن اونٹنیوں کے تھن تو بڑے بڑے ہوں مگر دودھ بہت کم ہو، اُن کو فخور کہتے ہیں، بھیڑ بکریاں بھی اسی طرح کی ہوں تو اُن کو بھی "فخور" کہیں گے۔

اس بنا پر فخور ایسا شخص ہوگا جس میں ظاہری نمود زیادہ اور حقیقی سود و بہبود کم ہو، کوئی وجہ نہیں کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ دوست رکھے۔

الھلال (کلکتہ)

کے مجلدات جن حضرات کے پاس موجود ہوں اور وہ انکو فروخت کرنا چاہیں وہ حسب ذیل پتہ پر مراسلت فرمائیں:-

چوہدری غلام احمد صاحب پرویز

ہوم ڈپارٹمنٹ۔ نئی دہلی

رسائل و مسائل

جواب تنقید بر تعلیمات قرآن

از

جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری

رسالہ ترجمان القرآن میں جو تنقید آپ نے شروع کی ہے اس کی دو قسطیں نظر سے گذریں۔ میں اس تنقید پر دو باتوں کا شکر گذار ہوں (پہلی) یہ کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے متانت اور سنجیدگی سے لکھا ہے جس کی ہمارے ملک کے رسالوں میں بہت کمی ہے دوسری یہ کہ مزید تشریح و تبیین کا موقع باقی چھوڑا ہے مگر اس کے ساتھ اس بات کی شکایت بھی ہے کہ میں نے تعلیمات قرآن لکھی ہے اس کے لئے نقد کی کسوٹی قرآن ہی کو بنانا چاہئے تھا۔ مگر آپنے عام مسلمانوں کے عقیدہ کو اس کے پرکھنے کا معیار مقرر کیا جس کے خلاف یہ کتاب ایک صدائے احتجاج ہے یہی وجہ ہے کہ آپ نے جس قدر اعتراضات کئے ہیں ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔ میں مختصراً ان کے جوابات لکھتا ہوں۔

جن و انس سب سے پہلی گرفت میری کتاب پر آپ کی یہ ہے کہ "جن و انس کے الفاظ قرآن میں جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں ان دونوں سے مراد انسانوں کے ہی طبقات ہو سکتے ہیں"۔ آخر میں آپ نے اس کو میری کمزوری پر محمول کیا اور کہا ہے کہ غالباً مولف نے ان لوگوں کی علامت نظر رکھی ہے جن کو جن نامی ایک آتشیں مخلوق سے انکار ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ صفحہ ۳۰ میں جہاں سے جن کا بیان میں نے شروع کیا ہے پہلا فقرہ یہی لکھا ہے کہ "جن ایک آتشیں مخلوق ہے

جس کو اللہ نے انسان سے پہلے آگ سے پیدا کیا" اگر میں جن کے منکروں سے مرعوب ہوتا تو سب سے پہلے آتشیں جن کے وجود کو کیوں تسلیم کر لیتا۔ حاشیہ میں میں نے بےشک یہ لکھا ہے۔

جن کا لفظ قرآن میں صرف مکّی سورتوں میں آیا ہے مدنی سورتوں میں کہیں نہیں آیا اور انس کا لفظ بلا جن کے سارے قرآن میں کہیں مستعمل ہی نہیں ہوا۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ جن و انس کے الفاظ جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں۔"

یہ یاد رہے کہ یہ حاشیہ کی عبارت یعنے میری اپنی بات ہے جس سے آپ کو اتفاق نہ ہو تو فوراً قلم زد کر دیجئے کیونکہ میں نے آغاز کتاب میں ہی لکھ دیا ہے کہ حاشیہ میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو اتنی وقعت بھی نہیں دیتا کہ کوئی صاحب ان پر اعتراض کی زحمت گوارا کریں۔ یہ تو صرف طلبار قرآن کو غور و فکر کی رہنمائی ہے اور بس، وہ بھی اس لفظ کے ساتھ کہ خیال ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ حتمی یا قطعی طور پر کہتا ہوں۔ وجہ اس خیال ہو سکنے کی حسب ذیل ہے آتشیں جن میں سے ابلیس ہے جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ۔ ۲۷ | وہ (ابلیس) اور اس کا قبیلہ تمکو وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے ہو۔

بخلاف اس کے حضرت سلیمانؑ علیہ السلام کے پاس جو جن کاریگر معمار اور غوطہ خور تھے وہ نظر آتے تھے۔ ان میں سے بعض اس قدر سرکش تھے کہ زنجیروں میں باندھ کر رکھے جاتے تھے۔ یہ انسانی صفات ہیں۔ یہ خیال کرنا نہایت بعید ہے کہ یہ وہی آتشیں جن تھے جو تانبے کی بڑی بڑی دیگیں محراب اور مورتیں وغیرہ بناتے تھے اور نہایت کامل شمشیرے اور بڑے ماہر معمار ہو گئے تھے۔ کیونکہ آتشیں جنوں کو ان امور سے کیا سروکار ہے۔ علاوہ بریں تاریخ اور خود توریت سے ہمکو ان فرزندوں

کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان نے مصر کے بادشاہ سے درخواست کرکے ان کو طلب کیا تھا اس لئے اگر میں نے طبایع کو اس مفہوم کی طرف توجہ دلائی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی غلطی نہیں کی۔

آپ کی دلیل ہے کہ شیاطین حضرت سلیمان کے تابع تھے۔ اور شیطان جن ہے۔ اور جن آگ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے شیاطین جو حضرت سلیمان کے تابع تھے آتشین جن تھے اس منطقی دلیل میں دوسرا مقدمہ یعنے شیطان جن ہے صحیح نہیں قرآن میں جو وارد ہے کہ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (وہ جن میں سے تھا سو اپنے رب کے حکم سے سرکشی کر بیٹھا) یہ ابلیس کے متعلق ہے نہ کہ شیطان کے ابلیس بے شک شیطان ہے لیکن ہر شیطان ابلیس نہیں ہے اس لئے ہر شیطان جن بھی نہیں ہے قرآن میں ہے۔ شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ نیز منافقوں کے سرغنوں کو بھی شیطان کہا گیا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ۔ کیا یہ دونوں بھی آتشین ہیں؟۔

مفہوم خلافت یہ بھی میں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ آدم کے متعلق خلیفۃ اللہ ہونے کا خیال صحیح نہیں۔ بلکہ وہ اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے جانشین تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ آدم یا فرزندان آدم کی شان میں جہاں بھی قرآن میں یہ لفظ آیا ہے "خلیفہ فی الارض" یا "خلافت فی الارض" آیا ہے آخر تک سارے قرآن میں کہیں "خلیفۃ اللہ" کا لفظ نہیں ہے۔ اس لئے آپ قرآن سے قطعاً آدم یا فرزند آدم کو خلیفۃ اللہ یا نائب حق ثابت نہیں کرسکتے۔ خیالی دلیلیں آپ نے دو لکھی ہیں۔

۱۔ "اگرچہ حق تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے لیکن پردہ میں ہے اور پردہ میں رہنے والے کی نیابت پردے کے باہر رہنے والا کر سکتا ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن میں اللہ کی شان میں آپنے صرف الباطن ہی دیکھا "الظاہر" نہیں دیکھا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

بے حجابی یہ کہ ہر اک شئے میں جلوہ آشکار
اس پہ پردہ یہ کہ صورت آشنا دیدہ ہے

یا اس کو معذور پردہ نشینوں پر قیاس کیا ہے؟ تعالی اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ ۱۷|۱۱ — ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو نہ تو اولاد رکھتا ہے ملک میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ کوئی اس کا مددگار ہے۔

۲۔ دوسری دلیل آپ کی یہ ہے کہ اس نیابت کے تخیل میں جو رفعتیں ہیں وہ پرانے ساکنین ارض کی جانشینی کے تخیل میں ہرگز نہیں"۔

اگر خیال کی رفعت اور شاعرانہ بلند پروازی مقصود ہے تو نیابت کے تخیل سے کہیں بلند تر منصور کا نعرہ ہے۔ مگر اس کو تو مولانا صاحبان نے دار پر چڑھا دیا حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں رفعت تخیل نہیں بلکہ حقیقت دیکھی جاتی ہے۔ نائب حق بنا کر آپ نے آدم کا رتبہ تو بڑھا دیا مگر اس کبیر متعال کو جو ہر شئے پر قادر ہے پردہ نشین قرار دیکر جس کو نائب کی احتیاج ہو کس قدر اپنے درجہ سے گرا دیا۔

اصل میں آپ اگر بغدادیوں کی تاریخ کا غائر مطالعہ کریں گے تو آپ پر واضح ہو جائیگا کہ خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ وغیرہ کے الفاظ وہ سانچے ہیں جن میں انھوں نے استبداد کے بت دینی روپ میں ڈھالے تھے

آدم کا گناہ

ساری دنیا یہی کہتی ہے کہ آدم نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا اور اس گناہ پر جنت سے نکالے گئے۔ قرآن میں بھی یہی ہے۔ چنانچہ ہبوط کے وقت اللہ نے آدم کے فرزندوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ ۲|۷ — اے آدم کے فرزندو! شیطان کہیں اسی طرح تم کو بھی نہ بہکائے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوا دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ شیطان کے ورغلانے سے شجر ممنوعہ جو آدم نے کھا لیا تھا اسی جرم پر جنت سے نکالے گئے۔ دوسری آیت میں مزید تصریح ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا — پھر شیطان نے ان کو اس سے پھسلا دیا اور ان کو اس

كَانَا فِيهِ ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ (آرام سے) جس میں تھے نکلوا دیا۔ اور ہم نے کہا کہ اترو تم
عَدُوٌّ ۲/۳۶ ایک دوسرے کے دشمن۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس ارحم الرٰحمین سے یہ ممکن ہے کہ گناہ بھی معاف کر دے جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے اور پھر اسی جرم میں جنت سے نکال بھی دے؟ اس لئے میں نے جو لکھا ہے کہ "آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا ورنہ جنت سے نہ نکالتا" یہ نہ تفسیر بالرّائے ہے نہ اس کی بری مثال ہے جیسا کہ آپ کا گمان ہے بلکہ خالص تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔

کیا وجہ ہے کہ جب حضرت داؤد مغفرت مانگتے ہیں فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۳۸/۲۴ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ۳۸/۲۵ مگر جب آدم و حوا مغفرت مانگتے ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۷/۲۳ تو جواب ملتا ہے۔ اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۷/۲۴ آپ کا یہ کہنا کہ اللہ نے آدم کی توبہ قبول فرمائی اور ان کو برگزیدہ کیا جس کو میں نے بھی لکھا ہے معافی کی دلیل نہیں۔ اگر توبہ و مغفرت اور عفو وغیرہ الفاظ میں جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں آپ فرق نہیں کریں گے تو اس کتاب کے بہت سے حقائق قطعاً سمجھ میں نہ آسکیں گے۔

مسئلہ غلامی ہر فرزند آدم زمین کا بادشاہ ہے۔ آدم کے متعلق ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۲/۳۰ اور فرزندان آدم کے بارے میں ہے وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ۶/۱۶۵ پھر ان کی شان میں ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ ۱۷/۷۰ کیا فرزند آدم کو جو زمین کی بادشاہت بلکہ آپ کی تفسیر کے مطابق نائب حق ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے غلام بنا لینا فطرت کے خلاف نہیں ہے؟ پھر جو چیز فطرت کے خلاف ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن اس کو جاری رکھے آپ اس قدر تو تسلیم کرتے ہیں کہ۔

غلامی کی دو صورتیں اس وقت دنیا میں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ بعض ممالک کے باشندوں کو پکڑ کر ان کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ دوسری یہ کہ جنگ میں جو

لوگ گرفتار ہوتے تھے ان کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ ان دونوں شکلوں میں سے پہلی شکل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ جو شخص کسی آزاد کو پکڑ کر بیچے گا اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی ہونگا۔ (بخاری کتاب البیوع) اور دوسری شکل کے متعلق اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے یا دشمن سے مسلمان قیدیوں کے ساتھ انکا مبادلہ کرلیا جائے لیکن اگر رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ نہ وصول ہو سکے اور دشمن اسیران جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بناکر رکھیں۔

یہ تو مسلم ہوا کہ کسی ازاد کو پکڑ کر غلام بنانا ایسا سنگین جرم ہے کہ اس کے مدعی قیامت کے دن خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ اب رہا اسیران جنگ کا معاملہ۔ ان کے متعلق قرآن میں قطعی حکم ہے کہ ﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً﴾ پھر یا تو احسان رکھکر انھیں چھوڑ دو یا فدیہ لیکر۔ فدیہ خواہ زر نقد یا سامان کی صورت میں ہو یا مبادلہ اسیران کی شکل میں مگر یہ قطعی حکم ہے کہ ان کو چھوڑ دو۔ بے شک اس وقت تک وہ اسیر رکھے جا سکتے ہیں جبتک کہ اسلامی مفاد کو ان کی رہائی سے خطرہ کا اندیشہ ہو لیکن ان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ قرآن نے خود حکومت کو یہ اختیار نہیں دیا کہ ان کو مملوک بنا کر بیچے یا سپاہیوں میں تقسیم کرے۔ بلکہ وہ سرکاری قیدی رہیں گے۔ اور عزت آبرو کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ برخلاف اس کے آپ یہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ اسیران جنگ کو آپس میں بانٹ کر ملکیت بنالیں اور انکو استعمال کرنا شروع کریں یا بھیڑ بکریوں کی طرح دست بدست بیچنے لگیں اور قیامت تک جبتک کہ ان کے مالک انکو آزاد نہ کریں وہ نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ غلام اور تمام انسانی حقوق سے محروم رکھے جائیں۔ نہ ایک پیسہ کے مالک ہوسکیں نہ ایک حبہ کے۔ اور خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوجائیں۔ ان کو انسانیت کا کوئی

حق کبھی نہ مل سکے

کیا یہ قرآن کی تعلیم ہے؟ کیا اس کو قرآن کی آیت یا کسی لفظ یا کسی حرف سے آپ ثابت کر سکتے ہیں؟ پھر میرے اوپر اعتراض کیوں ہے میں نے قرآن کی تعلیمات لکھی ہیں۔ آپ کا استدلال یہ ہے کہ:-

صحابہ کے عہد میں بہت سے اسیران جنگ کو ممالیک کی حیثیت سے رکھا گیا ہے۔
خود اہل بیت رسول کے گھروں میں جنگ کے پکڑے ہوئے غلام اور مفتوح ممالک سے آئی ہوئی لونڈیاں موجود تھیں۔

آپ کے نزدیک صحابہ اور اہلبیت رضی اللہ عنہم کا ہر فعل قرآنی تعلیم ہے مگر میرے نزدیک اُنکا وہی فعل دینی ہے جس کی سند قرآن سے مل سکے۔ ہاں اگر آپ تاریخی حدود میں آکر بحث کریں تو میں کافی اور شافی جواب دیسکتا ہوں کہ کن اسباب اور حالات کی وجہ سے صحابہ اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین مملوک بنانے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ان کے اس عمل کو جو ایک خاص ماحول میں تھا بلا کسی دلیل کے قرآنی تعلیم کہدینا جائز نہیں سمجھتا۔ قرآن ہر مسلمان کے گھر میں ہے۔ دیکھئے اور پھر دیکھئے اگر کوئی دلیل اس خلاف فطرت غلامی کی مل سکے تو پیش کیجئے۔

میں نے لکھا تھا کہ عرب میں چونکہ غلامی رائج تھی اور لوگوں کے پاس مملوک موجود تھے قرآن نے انہیں کو غلامی میں رہنے دیا اور ان کی آزادی کے لئے بھی بہت سی راہیں نکالدیں۔ اور آیندہ کے لئے رستہ ہی بند کر دیا۔" اس پر آپ لکھتے ہیں۔

"ایسی مصلحت شناسی کو خدا کی طرف منسوب کرنا دراصل خدا کی طرف کمزوری کو منسوب کرنا ہے۔ جس خدا نے شراب کو حرام کر دیا اور اس معاملہ میں بندوں کی ذرا پروا نہ کی۔ جس نے زنا کو حرام کر دیا اور اس کی ذرا پروا نہ کی کہ عرب اور دوسرے ممالک میں اس کا کس قدر رواج تھا اس کو کون سا امر غلامی کی ہر صورت کو

قطعاً حرام کر دینے سے روک سکتا تھا۔"

لیکن آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ شراب خواری۔ زنا یا قمار بازی وغیرہ شخصی اخلاقی جرائم ہیں جن کو فوراً روک ہی دینا چاہئے تھا بخلاف اس کے ما ملک ایمانکم معیشت میں داخل ہو چکے تھے۔ سینکڑوں گھرانے اور قبیلے ان کی کمائی پر گذارہ کرتے تھے ان کو فوراً آزادی کا حکم دینے سے بہت سے قبایل کی اقتصادی حالت خراب ہونے اور ان میں ابتری واقع ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے اس کا انسداد بتدریج مناسب تھا اور یہی اس علیم و حکیم نے کیا۔

ملکیت زمین قرآن سے زمین پر شخصی ملکیت کا حق ثابت نہیں ہوتا۔ اس پر آپ کو اعتراض ہے تو کوئی آیت ثبوت میں نقل کرتے کسی عہد کی تاریخ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ تاریخ ایک خاص ماحول رکھتی ہے ممکن ہے کہ وہ ماحول اب نہ ہو۔ دراصل قرآن کریم کے متعلق ہمارے اور آپ کے زاویہ نگاہ میں فرق ہے ہم قرآن کو ایک مکمل کتاب سمجھتے ہیں جس میں انسان کے جملہ دینی اور دنیاوی مسائل کا حل ہے۔ جس طرح یہ عالم فطرت انسانی معیشت کے لئے ہر طرح مکمل ہے اسی طرح یہ کلام فطرت یعنے قرآن جملہ عقدہائے معاشرت کو کھول سکتا ہے۔ آج انسانی قومیں انسانی معاشرت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بیقرار ہیں اور ان میں قبضۂ زمین کے مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت انسانی برادری میں نہایت غیر مساویانہ دولت کی تقسیم ہوئی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں اس کا حل نہیں ہے؟ آپ کا خیال یہ ہے کہ قرآن نے "وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ" کہکر صرف قدرت الٰہی کا اظہار کیا ہے مگر ہمارے نزدیک اس قدرت الٰہی کا شکر یہ ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں۔ اسی سورہ میں ہے "وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ" ۵۵/۲۴ یعنے اسی کے ہیں جہاز اونچے کھڑے ہوئے سمندر میں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی اور جاپانی جہاز کو سمندر میں دیکھکر آپ قدرت حق پر اس کی حمد و ثنا کریں یا خود بڑے بڑے جنگی جہاز تعمیر کر کے سمندر میں ڈالیں بہر صورت کلام الٰہی ایک فطری شئے ہے جس کے منافع محدود اور متعین نہیں ہوتے۔ اس لئے کسی آیت کے

متعلق آپ کا یہ کہنا کہ یہ صرف فلاں غرض کے لئے ہے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر اس سے دوسرے فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں تو ضرور حاصل کئے جائیں گے۔ یہی حال فطری اشیاء کا ہے۔ بابا آدم پانی کے متعلق یہ تو ضرور جانتے تھے کہ نہانے اور پینے کی چیز ہے۔ مگر فرزندان آدم نے اسی پانی سے بڑی بڑی مشینیں۔ ریلیں اور جہاز چلانے شروع کئے۔ اور ابھی تک اس کا فائدہ محدود نہیں ہے اسی سے "ماء ثقیل" نکالا جا چکا ہے جو دنیا کا سب سے قیمتی زہر ہے۔ اور اسی سے پٹرولیم بنانے کا نسخہ بھی تیار ہو چکا ہے بعینہ یہی حال قرآنی آیات کا ہے کہ ان کی فہم کو کسی ایک عہد کے ساتھ مخصوص کر دینا روا نہیں ہے۔ وہ ہر عہد میں ایک نیا عالم پیدا کر سکتی ہے۔

نظام عالم کی مدت عروج اور نزول امر کا جو مفہوم میں نے حاشیہ میں بیان کیا ہے اس کے متعلق مجھے خود تصریح کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ میں نے صاف لکھ دیا ہے کہ "عروج و نزول امر سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے" اس سے مقصود صرف دعوت غور و فکر ہے اور کچھ نہیں۔ ہاں اس آیت کی تفسیر میں آپ نے جو روایت لکھی ہے کہ:۔

"وہ قیامت کا دن ہے جو کافر کے لئے پچاس ہزار سال ہوگا اور مومن کے لئے ایک فرض نماز کے برابر"۔

اس سے امید ہے کہ لوگ قرآن کے مطلب کو زیادہ واضح طور پر سمجھ سکیں گے بشرطیکہ پہلے ان کو یہ تبلایا جائے کہ حاضرین محشر کی نگاہوں میں کیا فرق ہوگا کہ ایک اس کو پچاس ہزار سال شمار کریگا اور دوسرا پانچ منٹ بحالیکہ کفر و ایمان کے احساس زمانی میں یہ فرق کبھی نہ تھا۔

اسلام اور ایمان ان دونوں میں خود قرآن نے تفریق کی ہے جیسا کہ بدویوں نے کہا کہ ہم مومن ہیں۔ کہہ دے کہ تم مومن نہیں ہو کیونکہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے لیکن تم اپنے آپ کو مسلمان کہو" اس صحیح آیت پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے وہ میرے اوپر نہیں ہے بلکہ قرآن پر ہے۔ آپ کا یہ کہنا کہ "وہ مسلم نہیں کہا جا سکتا جو مومن نہ ہو" نہ صرف بلا دلیل بلکہ اس آیت سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم وہ ہے جو اسلام کے ظاہری اعمال بجالاتا ہے۔ چاہے دل میں کافر ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص قانون شریعت کی رو سے مسلمان شمار کیا جائیگا۔ اور اس کے ساتھ بشرطیکہ اس کی منافقت ثابت نہ ہوجائے مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جائیگا اور اسلامی حکومت میں اس کے حقوق مسلمانوں کے سے ہونگے اور مومن وہ مسلم ہے جس کے دل میں ایمان داخل ہو۔ ان دونوں میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے یعنے ہر مومن مسلم ہے مگر ہر مسلم مومن نہیں ہے۔ یہی قرآن سے معلوم ہوتا ہے اور یہی علمار اسلام نے بھی لکھا ہے۔

مسئلۂ تقدیر | قرآن کریم میں جن چیزوں کو ایمانیات میں شمار کیا ہے وہ صرف پانچ ہیں۔ اللہ۔ یوم آخر ملائکہ۔ کتاب اور رسول۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۲ | اور لیکن نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخر پر اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور نبیوں پر۔

انہی پانچوں کا انکار ضلالت بعیدہ ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۱۳۶/۴ | جو کوئی انکار کریگا اللہ سے اور ملائکہ سے اور کتابوں سے اور رسولوں سے اور قیامت کے دن سے تو وہ دور کی گمراہی میں پڑا۔

سارے قرآن کو بار بار دیکھ جائیے تقدیر کا کہیں ایمانیات میں ذکر ہے؟ مزید توضیح کے لئے میں عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایمان مجمل کے یہی پانچ اجزاء ہیں لیکن ایمان مفصل میں قرآن کا ایک ایک مسئلہ داخل ہے یہاں تک کہ اس بھیڑیے کی برأت بھی جس پر حضرت یوسف کے قتل کی تہمت لگائی گئی تھی۔ اگر اس سے بھی کوئی انکار کریگا تو وہ قرآن کا منکر ہوگا۔ تقدیر بھی قرآنی تعلیم ہے جس طرح وہ قرآن میں بیان کی گئی ہے اس کا ماننا ضروری ہے مگر وہ ایمان مجمل کے اجزاء میں سے نہیں ہے جس طرح بھیڑیے کی برأت۔ اصل میں تقدیر کا عقیدہ پہلی صدی ہجری میں جب جبر و قدر کی بحث چھڑی ہے ایمانیات میں داخل کیا گیا ہے۔

اتباع علما و صلحا

قرآن کی رو سے ہر زمانہ میں علماء و صلحاء کا فریضہ یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے واضح کریں خود ان کی باتیں کسی زمانہ میں بھی واجب الاتباع نہیں ہیں۔ اور یہ امر قرآن کی ان آیات سے واضح ہے جو میں نے نقل کی ہے۔ آپ نے ان کے اتباع کی دو دلیل دی ہے پہلی دلیل یہ آیت ہے "فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔"

لیکن اس میں اہل الذکر سے مراد اہل کتاب ہیں۔ چنانچہ دوسری آیت میں تصریح ہے۔

فَاِنْ کُنْتَ فِیْ شَکٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ فَسْئَلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکَ ۱۰/۹۴ — سو اگر تجھے شک ہو اس میں جو ہم نے تیری طرف اتارا ہے تو تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے سے کتاب پڑھتے ہیں۔

دراصل علماء اہل کتاب سے وحی کی تصدیق مطلوب ہے نہ کہ ان کے اتباع کی تعلیم۔ دوسری دلیل آپ کی یہ آیت ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ ۶/۹۰ — وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے اور تو انہی کی ہدایت کے پیچھے چل۔

مگر اس سے پہلے ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ۶/۸۹ — یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب قوت فیصلہ اور نبوت عطا کی ہے۔

اس لئے "فبھدٰھم" میں ہُم کا مرجع حضرات انبیاء ہیں جن کی پیروی اور اقتدا کا حکم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ یہاں علماء و صلحاء ہرگز مراد نہیں ہیں۔

بزرگان دین اور ائمہ و علماء سلف کا حق صرف یہی ہے کہ ان کے حالات اور علوم سے تاریخی اور علمی فائدے حاصل کریں۔ ان کی پیروی کسی زمانہ میں بھی واجب نہیں ہے۔ اور ان کے کسی قول کو بلا کسی قرآنی سند کے اٹل دین سمجھ لینا قطعی شرک ہے۔

علمِ غیبِ رُسل قرآن میں دو باتوں کی تصریح کی گئی ہے ایک یہ کہ انبیا کے سوا کسی کو علم غیب نہیں دیا جاتا ۔ دوسری یہ کہ انبیاء کو جو علم غیب دیا جاتا ہے وہ بندوں تک پہونچانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ دونوں باتیں مسلمانوں کے عام عقیدہ کے مطابق نہیں کیونکہ بالعموم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بزرگانِ دین اور اولیاء کرام کو بھی کشف اور کرامت سے غیب کی بعض باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ رہے انبیاء کرام سو وہ تو بقول آپ کے وایسرائے ہیں، ان کو راز درون پردہ سے زیادہ آگاہ ہونا ہی چاہیئے۔ اس صورت میں محل بحث غیب کا لفظ ہے اور اس کی سوائے اس کے اور کوئی تاویل نہیں ہو سکتی جو میں نے اختیار کی ہے یعنی اس سے مراد امور تشریعی لئے جائیں۔ جو انبیا کے اوپر بذریعہ وحی یعنی ملائکہ القا کئے جاتے ہیں تاکہ وہ بندوں میں ان کی تبلیغ کریں۔ یہ غیب صرف انہیں کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کی غرض تبلیغ ہے۔ اس تاویل سے دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ پر برحق رہتی ہیں۔ اور عام عقیدہ کو بھی صدمہ نہیں پہونچتا۔

استواء علی العرش بے شک قرآن کے دوسرے مترجموں کی طرح میں نے بھی اس لفظ کا ترجمہ کہیں بیٹھنا کہیں اور کہیں براجنا۔ مگر ص ۶۲ میں تصریح کر دی ہے کہ ”عرش الٰہی سے مراد کوئی مقر حکومت یا مرکز نہیں ہے بلکہ خود حکومت اور عالم خلق پر تسلط رکھنے اور اس کے انتظام کو استواء علی العرش سے تعبیر کیا گیا ہے“ اس تصریح کے بعد آپکا اعتراض صرف لفظی رہ جاتا ہے۔ اگر استواء کے ترجمے کے لئے اردو میں کوئی لفظ اچھا مل سکے تو مجھے اس کے اختیار کرنے میں مطلق تامل نہ ہوگا۔

متفرقات میں آپ نے میرے اوپر تجدد کا الزام لگانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کے ساتھ قدامت پرستی کے فضائل و برکات پر قرآن کی کچھ آیات درج نہ فرمائیں۔ دراصل مسلم کا شیوہ نہ تجدد پرستی ہے نہ قدامت پرستی بلکہ حق پرستی ہے جو ہر زمان و مکان سے بالاتر ہے۔

آپ نے یہ تو صحیح لکھا ہے کہ قرآن کے لئے انسانی علوم کے سہاروں کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں لیکن اس سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے کہ انسانی علوم کو قرآن کے سہارے کی ضرورت ہے پھر ہم جب ماحول

میں ہیں۔اس میں اگر اپنے علوم میں قرآن سے مدد لیں تو کونسا گناہ ہے قرآن میں ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ۲۷ ــ اور ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۶۹ ــ ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۶۹ ــ ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کیلئے کی ہے جو سمجھ رکھتے ہیں۔

قرآن کی اصطلاح میں یہ علماء و فقہاء وہ الو الالباب ہیں جو حقائق فطرت اور مَلَكُوْتُ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ میں غور و فکر کرتے ہیں۔ چونکہ علوم فطرت ہمیشہ آگے بڑھنے والے ہیں اس لئے فہم قرآن کو بھی کسی ماحول مخصوص کے ساتھ مقید کر دینا مناسب نہیں۔ یہ کتاب ہر زمانے سے بالاتر ہے اور ہر علمی تقدم کا ساتھ دے سکتی ہے۔

مکتبہ علمیہ

ایک مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کتابیں مل سکتی ہیں۔ طلبہ کے لئے درسی کتابوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جاسکتی ہیں۔

مکتبہ علمیہ۔ چارمینار حیدرآباد دکن

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کریگا مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگواسکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی انکو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام کسی طویل مدت کے لئے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہئے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب مسائل تمام اڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں لیکن اڈیٹر پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن ۔ خیرت آباد۔ حیدرآباد (دکن)

(طابع و ناشر ابوالاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن